تیرے لیے ہے میرا دل
مصنفہ
شازیہ چوھدری

پبلشر، مبین خٹک

گل قریش پبلی کیشنز لاہور

نام	-------------	تیرے لیے ہے میرا دل
مصنفہ	-------------	شازیہ چوھدری
کمپوزنگ	-------------	زبیر
پروف ریڈنگ	-------------	ارسلان خان
پرنٹر	-------------	روشن پریس
تعداد	-------------	600

اسٹاکسٹ:۔

طیبہ بکسٹال پبلشرز اینڈ بک سیلرز
0301 4072442
Fax:7239884
دوکان نمبر 23 فرسٹ فلور الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور پاکستان

بیتے لمحوں کا ایک خط

تھرڈ ایئر میں کچھ عرصے کے لیے عارضی طور پر ایک ٹیچر نے ہمیں پڑھایا تھا۔ انہیں قریب سے جان کر مجھے زندگی میں پہلی بار یہ ادراک ہوا کہ علم کو عملی زندگی میں کس طرح اپنا کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مجھ پر صحیح معنوں میں یہ کھلا کہ علم بغیر عمل کے اس موتی کی مانند ہے جسے کوئی کم شناس جوہری شیشہ سمجھ کے خاک میں رول دے۔ زندگی کی مشکلات کی گھاس کاٹنے کے لیے علم کے لوہے سے عمل کی قینچی تیار کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ گو ان سے رفاقت بہت مختصر عرصے تک رہی مگر اس محدود مدت کی رفاقت نے مجھے اپنی ذات کا عرفان حاصل کر کے خود کو ایک سیدھی پکی روشن منزل کا راہی بنانے میں بہت مدد دی۔

رحیم گل کی لکھی ہوئی کتاب ''جنت کی تلاش'' مجھے اتنی پسند ہے کہ اب تک کم و بیش تیس مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔ اس میں فلسفہ زندگی، سیر و سیاحت اور قدرتی مناظر کی عکاسی کے بیچ بیچ اس خوبصورتی سے کہانی ایڈجسٹ کی گئی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا سب کچھ قاری کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ مجھے شگفتہ انداز تحریر پر مشتمل سفرنامے بہت پسند ہیں جیسے مستنصر حسین تارڑ، ابن انشا، صدیق سالک

کرنل محمد خان وغیرہ وغیرہ کی سیاحت کے حوالے سے لکھی گئی کتابیں جتنی مرتبہ پڑھ لوں دل سیر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اگر قارئین ہنسی نہ اڑانے کا پرامس کریں تو بتادوں کہ میں بچوں کے جاسوسی ادب میں ایک معتبر نام۔ اشتیاق احمد کے لکھے ہوئے ہر ناول (خصوصاً خاص نمبر) پر مرتی ہوں۔ بچپن سے اب تک ان کے ناولوں کے مخصوص کردار ذہن کے خانے میں محفوظ ہیں۔ تینوں جاسوسی پارٹیوں کے کارنامے پر مشتمل اشتیاق احمد کا خاص نمبر ہو۔ ڈرائی فروٹ یا منبو وافر مقدار میں موجود ہوں۔ اپنا بیڈروم ہو تو واقعی دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں۔" پسند اس لیے ہیں ان کے ناول کہ یہ مزاح، اصلاح اور سنسنی خیز ہنگامہ آرائیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کسی نکتہ داں نے انسانی ذہن کا بڑا خوبصورت تجزیہ کیا تھا۔

وہ کہتا ہے۔

- چھوٹے ذہن کے لوگ شخصیت پر بحث کرتے ہیں۔
- اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے قطعات پر بحث کرتے ہیں۔
- بڑے ذہن کے مالک "نظریات" پر بحث کرتے ہیں۔
- عظیم ذہن کے لوگ خاموشی سے عمل پیرا رہتے ہیں۔
- اور کتنے عظیم تر ہیں وہ لوگ جن کے پاس مثال دینے کے لیے اقوال نہیں بلکہ ان کے اعمال ہوتے ہیں۔

وہ ایک لمحہ۔ وہ لمحہ جب میرے میٹرک کا رزلٹ آیا اور جب میرا ایف اے سی کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ دونوں کے نتائج اتنے غیر متوقع تھے کہ ان دونوں کا تصور آج بھی جسم و جاں میں سنسنی سی دوڑا دیتا ہے۔

شازیہ چوہدری

"خدایا! اب چھوڑ بھی دے لڑکی۔ کیا جان نکالے گی میری۔ تو بہ سانسیں اتھل پتھل کر کے کے رکھ ڈالی ہیں" نانی اس کی بھرپور پرجوش گرفت میں چھڑ چھڑاتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

"ہائے نانی! اتنے عرصے بعد دیکھ رہی ہوں آپ کو۔"

اس کی مسرتوں کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔

"اللہ جی کتنی بدل گئی ہیں آپ۔ آپ کے بال بھی سفید ہو گئے ہیں۔ ہیں ناں۔ بالکل برف کی طرح"

اس نے بچوں کے سے اشتیاق سے چھو کر دیکھنا شروع کر دیا۔

"بہت نرم نرم لگ رہے ہیں۔"

"اُف خدایا۔"

نانی جان نے سر تھام لیا۔

''بھلا کوئی فائدہ ہوا تجھے سبین کے ہاں گیارہ سال گزارنے کا۔ دس برس کی تھی جب گئی تھی۔ دماغ اس وقت بھی اتنا سا تھا اور اب بھی وہی پہلے والی صورتِ حال ہے۔ بس قد بڑھ گیا ہے۔''

نانی جان اسے سرتاپا جانچتے ہوئے تجزیہ کر رہی تھیں۔ اور وہ بھی نہایت مایوسی کے عالم میں۔

جواب میں اس نے برا سا منہ بنالیا۔ نانی! اب آپ میری اصل عمر تو نہ بتانے بیٹھ جائیں سب کو۔ ادھر وہ بھی تو ہے رشید خان، رشید سن لے گا تو سارے زمانے میں نشر کرنے تک چین سے نہیں بیٹھے گا۔ ارے ہاں ہے کدھر وہ؟ وہ ادھر ادھر دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

ہونا کدھر ہے کچن میں ہوگا۔ تو دو گھڑی زبان کی کترنی بند کر کے بیٹھ کے سانس تو لے لے ڈھنگ سے۔ اور وہ رشید تیرے برابر کا ہے؟ کچھ عقل کر لے۔''

نانی لتاڑنے کے ساتھ ساتھ اسے آرام و سکون کی تاکید بھی کر رہے تھیں۔ رشید خان ان کا پرانا ملازم تھا۔ جب وہ سبین خالہ کے ہاں گئی تھی اس وقت رشید خان کا گاؤں میں اپنی منگیتر سے عشق زوروں پہ چل رہا تھا اس کی کامیابی اور سنجیدگی کا گراف یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ اس کی محبت میں

وہ شاعر ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں زرشہ کو عشق، عاشقی کے قصوں کا کیا پتا ہوتا البتہ رشید خان کے ہجر و فراق میں ڈوبے سرے شعر بے وقت سن سن کر اچھی خاصی خبطی ہو جایا کرتی تھی۔

''اس بے چارے باورچی شاعر کی شادی ہو گئی اپنی کلثوم عرف کلو سے یا نہیں۔؟''

اس نے خبر گیری گویا اپنا اولین فرض سمجھا تھا۔

''تو ہوتی کیوں نہ۔ اسی سال ہی ہو گئی تھی اب تو سات بچے ہیں۔ آٹھواں ابھی متوقع ہے۔''

''دونوں میں بڑا پیار ہوگا۔ بڑے سلوک محبت سے رہ رہے ہوں گے۔'' زرشہ نے قیافہ لگایا تھا بڑے اعتماد سے۔

جواب میں نانی ہنس پڑیں اے لو۔ ایسا ویسا سلوک۔ دن رات چمچے، چھریاں، پتیل کے گلاس، گلدان اور چپٹے جوتے چلتے ہیں۔ وہ برتن اور جوتوں کی کم بختی لاتی ہے اور یہ اسے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیتا ہے۔ بچے بے چارے ریفری کا کردار ادا کرنے کے چکر میں بیچ میں پسے جاتے ہیں کوئی ایک تماشا ہوتا ہے۔ یہاں اب رہو گی تو دیکھ لینا خود ہی۔'' وہ بڑے دلچسپ سے انداز میں نقشہ کشی کر رہی تھیں۔

''نانی! وہ میں دادی بی سے مل آؤں۔'' کچھ توقف کے بعد اس

نے دزدیدہ نظروں سے عائشہ بیگم کا چہرہ دیکھتے ہوئے اٹکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

جواب میں ان کے چہرے پر ناگواری اور سرد مہری کے تاثرات سمٹ آئے۔

"ابھی تو آرہی ہو سیدھی ایئرپورٹ سے اتنی گرمی میں۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ نہ کپڑے بدلے ہیں اور دادی کا عشق سر پر سوار ہو گیا آتے ہی۔"

"ارے ایسی تو کوئی بات ہیں نانی جان! بھلا میں کون سا ان کے پیار میں مری جارہی ہوں ملنے کے لیے۔"

اس نے اٹھ کر نانی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے انہیں منانے کی سعی کی۔

"بات تو ایسی ہی ہے جب ہی تو اتنے سالوں بعد بھی تجھے نہیں بھولے وہ لوگ۔ ہاں بھئی نانی کون ہوتی ہے وہ کس کھاتے میں گردانی جائے گی۔ چاہے کلیجہ بھی نکال کر وار دیں ننھیال والے تو بھی اولاد تو ددھیال کے راگ ہی الاپے گی۔"

نانی کا انداز اچھا خاصا تپا ہوا تھا۔ وہ انہیں راضی کرنے کی تدبیریں کرنے لگی۔

"نانی آپ تو خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہیں۔"

بالآخر اسے ایک نکتہ سوجھ گیا۔

سو بڑے تیکھے سے انداز میں کہنے لگی۔ "سوچیں تو بھلا یہ سب کچھ آپ کے لیے ہی تو کر رہی ہوں میں ان سے سچے مچی تھوڑی ملنے جاؤں گی۔ بس رسم نبھانی ہے اگر میں نہیں جاؤں گی تو خبر ہے دادی بی کیا خیال کریں گی؟"

"بھلا کیا خیال کریں گی۔"

اس کے استفہامی انداز نے انہیں بھی متجسس کر دیا سو ناراضگی بھول کر پوری تندہی سے استفسار کرنے لگیں۔

"وہ خیال کریں گی کہ عائشہ بیگم نے نواسی کو پڑھا دیا ہے کہ دادی کے ہاں نہ جانا۔

سوچیے تو ذرا ان کے ہاتھ ایک نیا شوشہ آجائے گا پھر ایسے لتے لیں گی ایسے لتے لیں گی کہ کیا ہی کسی نے لیے ہوں گے۔"

"بات تو تم نے پتے کی' کی ہے۔"

کافی دیر تک ٹھوڑی پر ہتھیلی ٹکا کر سوچ بچار کرنے کے بعد وہ بالآخر متفق ہو گئیں۔

"چلو ٹھیک ہے پھر چلی جانا کھڑے کھڑے سلام جھاڑ آنا۔ ورنہ پھر بات کا بتنگڑ بناتی پھریں گی۔"

نانی طنزیہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"پرنس لیجیو۔ زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی بہت مسکرا مسکرا کے ملنا۔ شکل پہ سنجیدگی اور بردباری کا خول چڑھا کے جانا۔ اور دیکھو **لیجیو**۔ اپنے تایا کی اولاد کو بہت منہ نہ لگائیو۔ سمجھ آئی"

نانی اچھی طرح اسے "پکا" کر رہی تھیں۔

"بالکل سمجھ میں آ گیا نانی جان۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے تابعداری کا عظیم مظاہرہ پیش کیا۔ آپ فکر نہ کیجیے گا۔ میں ایسی رکھائی، بے مروتی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کروں گی کہ آپ دیکھتی رہ جائیں گی۔ مگر افسوس کہ آپ دیکھ نہیں سکیں گی کیونکہ آپ میرے ہمراہ نہیں ہوں گی۔ البتہ یہیں بیٹھ کے دل ہی دل میں تصور کر کے آپ جی بھر کے محظوظ ہو سکتی ہیں۔"

"اب جاؤ اور نہا کر کپڑے بدل لو۔ تمہارا کمرہ میں نے سیٹ کرا دیا تھا۔ رشید خان سے۔"

آپ نے دیکھ لینا تھا۔ ایسا نہ ہو کہیں اپنا دیوان سجا گیا ہو' وہ سرخ کارپٹ سے ڈھکی سیڑھیوں کی سمت بڑھتے ہوئے فکرمندی سے بولی تھی۔

"توبہ ہے جانے یہاں بہروں کا بسیرا ہے جو کوئی سن کے نہیں دے رہا۔"

اپنے گھر کے عین سامنے والے بنگلے کی کال بیل پر ہاتھ رکھے رکھے اس کی انگلیاں دکھنے لگی تھیں۔ خدا خدا کر کے داخلی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر تیز قدم گیٹ میں سمت بڑھتے محسوس ہوئے۔

"کیا مصیبت ہے کیا امی جان نے دل بہلانے کے لیے باجا نہیں لے کے دیا جو دوسروں کے گھروں کی گھنٹیاں بجائی جا رہی ہیں۔"

ایک نرم نرم غصیلی بھاری آواز کے ساتھ کھٹاک سے گیٹ پورے کا پورا چوپٹ کھل گیا تھا۔

"دراصل جی۔ میں۔ وہ۔ میں بڑی دیر سے بیل بجا رہی تھی۔"

ہینڈز اپ کر کے تجوری پر ہاتھ صاف کرنے کے ارادے سے اندر جا رہی ہوں۔"

"کیا۔کیا۔کیا۔؟"

اس کے تو زمین و آسمان ایک لمحے میں آنکھوں میں گھوم گئے۔

"میں میں اپنے تایا کے گھر بم رکھنے یا تجوری صاف کرنے آؤں گی۔؟"

مارے صدمے اور غصے کے وہ پہلے زرد اور پھر سرخ ہوگئی۔

"آپ چلیں ذرا میرے ساتھ اندر میں آپ کو دادی بی کے سامنے پیش کرتی ہوں۔وہ اچھی طرح آپ کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گی۔غضب خدا کا خونی رشتوں پر ایسی انتہا درجے کے بے اعتباری کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔"

وہ طیش کے عالم میں اسے آگے بڑھنے کا کہہ رہی تھی۔

وہ یکلخت ٹھٹھک سا گیا تھا اور از سر نو اس کے حسن و لطافت سے بھرپور سراپے کی پڑتال کرنے لگا۔وہ اس کے اسی جامد حالت کا فائدہ اٹھا کر داخلی دروازے سے اندر کی سمت بڑھ گئی تھی۔اندر جا کر اس کا واسطہ ٹی وی لاؤنج میں مختلف پوزیشن سنبھالے بہت سے افراد سے پڑا۔عین درمیان میں بڑا سا کیرم بورڈ بچھا ہوا تھا جس کے ارد گرد ایک لڑکا اور ایک لڑکی برسر پیکار تھے۔کچھ فاصلے پر ایک لڑکی ہاتھ میں کوئی کتاب تھامے اس میں مگن

بوکھلاہٹ میں اس نے وضاحت کی۔

"بہت خوب۔"

گیٹ سے برآمد ہونے والا صحت مندی کی چمک لیے تروتازہ سرخی مائل رنگت سے بھرپور چہرے پہ انتہا درجے کی استہزاء سجائے اسے سر تا پا جانچ رہا تھا۔نوجوان کا لانبا مضبوط قد کاٹھ اور گھنی سیاہ مونچھیں اس کی مردانگی کا بھرپور اظہار کر رہی تھیں۔

"تو گویا بہت دیر سے آپ ،ایک غلطی کا بار بار ارتکاب کر رہی تھیں۔اتنی ڈھٹائی سے میں نے کسی کو چور اور وہ بھی سینہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

انداز میں سراسر طنز تھا۔اس کی ندامت کوفت میں ڈھلنے لگی۔

"بیل ہی تو بجائی ہے کوئی بگلِ حشر تو نہیں بجا دیا جو آپ اتنا باؤلے ہو رہے ہیں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"ویسے آپ ہیں کون صاحب۔اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔؟"

اسے فکر ہوئی۔آخر یہ کون مشکوک بندہ ہے جو مفت میں رعب ڈال رہا ہے۔

اسکے سوال کے جواب میں ایک نظر اس پر ڈال کر پھر آسمان کی جانب انتہائی استعجاب کے عالم میں دیکھا تھا۔گویا پوچھ رہا ہو الہٰی یہ کیا شے ہے تو ہی کچھ روشنی ڈال اس چیز پر۔اس کی اس حرکت پر وہ تلملا کر رہ گئی۔

جان گئی تھی وہ اسے کیا جتلانا چاہ رہا ہے۔

محترمہ! آپ یقیناً اپنی یادداشت اپنے ذہن سمیت کہیں رکھ کر بھول آئی ہیں۔ جائیے پہلے اسے تلاش کیجیے۔''

اس نے نہایت سنجیدگی کے عالم میں مشورہ دیا تھا۔

''ویسے اس سلسلے میں آپ کو ضرورت ہو تو میں بھی مدد کے لیے تیار ہوں۔''

''آپ ہوتے کون ہیں مجھ سے اس طرح بات کرنے والے۔'' وہ چراغ پا ہوگئی۔

''کوئی تمیز لحاظ آپ کو چھو کر نہیں گزرا۔؟''

وہ بری طرح اس پر چڑھ دوڑی تھی۔

''ہٹیں پرے۔ راستہ دیں۔ ابھی تائی جان سے پوچھتی ہوں جانے کس قسم کے عقل کے دشمنوں کو جگہ دے رکھی ہے گھر میں۔''

وہ پیر پٹختی ہوئی اندر کی سمت بڑھی تھی۔ مگر اسی اثنا میں بجلی کی سی تیزی سے وہ اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔

''محترمہ بغیر تعارف کرائے آپ اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔ کون جانے آپ کا تخریب کاری کرنے کا پروگرام ہو۔ یا۔۔۔ پھر تین بجے اس وقت گھر کی بھولی بھالی، عمر رسیدہ خواتین اور ڈرپوک لڑکیوں کو نقلی ریوالور سے

تھی۔ ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی تندہی سے چلغوزے کھانے اور کیرم بورڈ پر نمایاں ہونے والے نتائج کی بے لاگ کمنٹری کرنے میں مگن تھی۔ ایک سائیڈ پر کشن کے سہارے دادی بی نیم دراز ملازمہ کی بیٹی زہرہ سے سر دبوا رہی تھیں۔

''السلام علیکم۔''

نانی جان کی ہدایت فراموش کر کے اس نے بڑے پرجوش لہجے میں کہتے ہوئے ماحول کی ترتیب میں انتشار پیدا کیا تھا۔

اس کی آواز کے ساتھ ہی جیسے ایک لمحے کے لیے ہر سرگرمی۔ جمود کا شکار ہوگئی۔ سب لوگ ہاتھ روک کر اس کے سمت متوجہ ہو گئے تھے۔ ان کی نظروں میں ایک جیسے تحیر اور تعجب کی واضح تحریریں درج تھیں۔

پہچان کی کوئی علامت ان کے چہروں پر نہ پا کر وہ اچھی خاصی مایوس ہوگئی اور ردعمل کے طور پر کچھ سپاٹ سے انداز میں بولی۔

''شاید آپ لوگوں کے لیے میری آواز اور وجود نامانوس سا ہے۔ مجھے زرشہ حسن کہتے ہیں حسن عباسی کی بیٹی۔''

اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے تعارف کروایا تھا۔ حد ہوگئی۔ یعنی کوئی پہچان کے ہی نہیں دے رہا۔

''حسن عباسی کی بیٹی۔ ارے بچی یہ تم ہو''

خدیجہ بی بی عینک کی کمانی درست کرتی اٹھیں اور خاصی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اسے گلے لگا کر پیٹھ تھپتھپائی۔

"کب آئیں تم مصر سے۔؟"

اسے قریب بٹھا کر وہ دریافت کر رہی تھیں۔

"دس بجے کے قریب آئی تھی آج۔"

دادی بی کا منہ بن گیا۔ "دس بجے کی آئی ہو اور دادی سے ملنے اب آ رہی ہو چار بجے۔"

پھر انہوں نے سرد آہ بھری۔

"ہاں بھئی دادی کس کھاتے میں آتی ہیں۔ بھلا اب کون پوچھے گا حسن بیٹے کی وفات کے بعد تو یوں بھی اس عورت نے تمہیں ہمارے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ بھلا وہ کیوں چاہنے لگی کہ تم اپنے ددھیال کے رشتہ داروں سے گھلو ملو۔ میں جانتی نہیں اسے۔"

"نہیں دادی بی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

اسے نئے سرے سے منانے کی رسم ادا کرنی پڑی۔

"خیر۔ مرضی ہے بھئی۔"

دادی بی نے خفگی دکھانے کا پروگرام فی الحال ترک کر دیا۔

"آؤ تو سر آنکھوں پر۔ اور اگر نہیں بھی آتیں تو بھی کچھ شکوہ

نہیں۔ خیر تم ان سے ملو۔ یہ تمہارے تایا زاد بہن بھائی ہیں۔ یہ نبیل ہے اور یہ رفعت ہے دونوں اوپر تلے کے ہیں' اس لیے چونچیں پھنسائے ہی رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹی ندرت ہے۔ اور یہ نگین ہے یہ میری بھانجی کی بیٹی ادھر ہمارے پاس ہی رہتی ہے جمیلہ کہاں ہو تم۔ بھئی یہ تمہاری بھتیجی آئی ہے کچن میں ہوگی۔ جاری زرا بلا کے لا اسے۔"

تعارف کروانے کے بعد آپس میں ہیلو ہائے ہوئی۔ اس نے خونی رشتے کی کشش کے زیر اثر ان سے بے تکلفانہ اپنائیت کا اظہار کرنا چاہا مگر پھر ایک دم نانی جان کی پڑھائی ہوئی پٹی یاد آ گئی۔ سو ریزروی ہو کر بیٹھ گئی۔

"وہ ماسٹر پیس تو رہ ہی گیا دادی تعارف ہونے سے" نبیل اس نوجوان کو اندر آتے دیکھ کر دادی کو یاد دلا رہا تھا۔

"ارے ہاں یہ ارسل ہے ان سب سے بڑا۔ پانچ سال بعد لوٹا ہے لندن سے ابھی پچھلے مہینے۔ اور بچے یہ زرشہ ہے۔ وہ تمہارے چچا حسن عباسی کی بیٹی ہے۔"

"ان کو اپنی خبر نہیں۔ ہم سے تعارف کیا ذہن میں رکھ سکیں گی۔" وہ بڑے چبھتے ہوئے مگر بظاہر لاپروا سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

زرشہ کا خون کھول رہا تھا۔

"ویسے رسماً کہہ دینا چاہیے کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

وہ کہہ رہا تھا۔

''ویسے بھی اس قدر حسین اور خوبصورت لوگوں سے مل کر خوش نہ ہونا تو یوں بھی گناہ میں شمار ہوتا ہے کیوں دادی جان۔''

وہ سرتاپا سلگ اٹھی۔

''آپ مجھ سے بات نہ کریں تو یہ دونوں کے حق میں بہتر رہے گا۔''

''حق حقوق دنیا کے لین دین کے جھگڑے آپ لوگوں کے ننھے سے دماغ میں کہاں جگہ پا سکتے ہیں۔'' اس کا انداز بدستور جلانے والا تھا۔

وہ زچ ہو کر رہ گئی۔

''میں نے کون سی بھینس چرالی ہے آپ کی جو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں بڑا لحاظ کر رہی ہوں ورنہ۔''

''حالانکہ سوچنے کی بات ہے' ہاتھ دھو کر بھی فرق تو کچھ نہیں پڑے گا۔''

نبیل بول اٹھا۔

''بلکہ وہی نحوست برستی رہے گی۔''

رفعت نے بھی برابر کا حصہ لیا۔

''اُف خدایا۔''

وہ ان کی ایک سی طنزیہ باتوں سے بری طرح عاجز آ گئی تھی۔

''غلطی ہو گئی جو میں ملنے آ گئی۔''

وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بڑا احسان کیا ہماری جان ناتواں پر۔ آپ نہ آتیں تو اس چمن میں اجالے بکھر سکتے تھے بھلا' آپ کا وجود تو روشنی اور خوشبوؤں کا مرقع ہے۔''

ارسل نہایت کاٹ دار انداز میں طنز فرما رہا تھا۔

''ہاں! ہیں ہم حسین وجمیل اور خوبصورت پھر۔؟''

وہ بلبلا کر بولی۔

''بس ٹھنڈ پڑ گئی سینے میں۔؟''

اس نے بھی حد پار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کب تک مروت کا مظاہرہ کرتی۔ یوں بھی نانی جان کی ہدایت پر عمل کرنے کا اس سے بڑھ کر کوئی مناسب موقع نہیں مل سکتا تھا۔

''یہ آپ لوگوں کا احساس کمتری بول رہا ہے اور کچھ نہیں۔ انتقام اور جھلاہٹ نے آپ کو ایسا اندھا کر دیا ہے کہ کسی آئے گئے کا لحاظ کرنے کی رسم بھی فراموش کر بیٹھے ہیں۔''

''جی ہاں۔ جی ہاں۔''

ارسل کھنکارا تھا۔

یہ رسم آپ کی نانی محترمہ عائشہ بیگم جو بہ حسن وخوبی سرانجام دے لیتی ہیں۔ بہت دفعہ ان کی 'مہمان نوازی' اعلاظرفی اور تحمل مزاجی' کے عملی

مظاہروں سے واسطہ پڑا ہے۔"

"تو پھر ہوں گے بھی اسی قابل۔"

وہ جل کر بولی۔

"جیسی حرکتیں ہوں گی ویسے ہی خاطر تواضع ہوگی۔"

پھر وہ دادی بی کی طرف متوجہ ہوئی "اچھا دادی میں چلتی ہوں۔"

"اے میٹھو ناں ذرا دم بھر کو۔"

دادی نے ٹوکا۔

"اپنی تائی سے تو مل لو کیا نانی گیٹ پر توپ بندوق لے کر کھڑی ہیں۔؟"

"لاحول ولاقوۃ۔"

ان کے کٹیلے انداز پر وہ بری طرح جزبز ہوگئی تھی۔

تائی جمیلہ دیگر افراد کے رویوں سے قطع نظر بڑے کھلے دل سے ملیں۔ اصرار سے چائے پلوائی۔

ندرت اور نگین بھی کافی حد تک اس سے گھل مل گئی تھیں۔ اور خوش اخلاقی اور قرابت داری کا خیال کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے پیش آرہی تھیں۔ باقی البتہ ابھی تک نامعلوم سی تلخی کڑواہٹ اور کٹیلے پن کے احساسات سے لبریز ردعمل دکھا رہے تھے۔

اس کی وجہ وہ بخوبی جانتی تھی۔ یہ تلخی اور تناؤ تو برسوں سے چلا آرہا تھا۔ دونوں فیملیز کے درمیان یہی وجہ تھی کہ اتنے سالوں سے آمنے سامنے رہائش پزیر ہونے کے باوجود دونوں گھرانے ایک دوسرے کے حال حالات سے لاعلم رہتے تھے۔ خصوصاً دادی اور نانی تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھیں۔

"اتنی دیر کردی تو نے۔ کیا کر رہی تھی؟ کیا بہت دل لگ گیا تھا ادھر۔" نانی کو قدرتی تشویش ہو رہی تھی۔

"میں تو اپنے حساب سے بہت جلد آئی ہوں نانی۔"

وہ حیران ہوئی۔

"آپ کی ہدایت کے مطابق کسی کو زیادہ منہ نہیں لگایا۔"

"اچھا کیا۔"

نانی مطمئن سی دکھائی دینے لگیں۔

وہ لوگ ہیں ہی اسی قابل۔ ہونہہ۔ جانے کیا سمجھتی ہیں یہ محترمہ خدیجہ بی بی۔ نانی نے دانت پیسے تھے۔"

میں نے بھی کبھی لفٹ نہیں کرائی ان لڑکوں اور لڑکیوں کو۔ کبھی کبھار شروع میں چلے آتے تھے جی آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہمارے لائق

کوئی خدمت۔'' نانی نے نقل اتاری۔

''میں نے کہا یہی بری مہربانی کرو کہ اپنی شکلیں دکھا کر میرا دل نہ جلایا کرو۔

اے زہرہ خاتون۔ دنیا کی سست ترین مخلوق۔ اپنے رینگتے قدموں کو تیز کیجیے اور فیلڈنگ میں مقدور بھر پھرتی دکھانے کی کوشش کیجیے۔''

نبیل بحیثیت کپتان اس کے مزاج پوچھ رہا تھا۔ ارسل رنز پہ رنز بناتا جا رہا تھا اور ادھر اس کے ساتھ زہرہ اور ندرت کمال درجے کی کاہلی سے کام لے رہی تھیں۔ رفعت اور نگین ارسل کی ساتھی تھیں۔

''بھیا! اتنا تو دوڑ رہی ہوں۔ دیکھیے تو سانس تک پھول کے کیا ہو گیا ہے۔''

محترمہ زہرہ خاتون نے خاصا تنگ کر اطلاع دی تھی۔

''دوڑیے۔ ضرور دوڑیے۔ کس نے آپ کو دوڑنے سے منع کیا ہے۔ مگر خدارا گیند کی جانب دوڑیے۔ جس سمت آپ لڑھکنیاں کھاتی

بھاگ رہی ہیں‘ وہاں گیند نہیں بلی بیٹھتی ہوئی ہے۔“

نبیل جل بھن کر بظاہر نہایت شائستگی سے اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔

”باتیں کم کیجیے میاں اور یہ ہمارا چھکا سنبھالیے۔“

ارسل نے اسے خبردار کیا تھا۔

”وہ مارا۔“

رفعت اچھل اچھل کر تالیاں پیٹنے لگی۔

واقعی چھکا ہو گیا تھا۔ لیکن گیند باؤنڈری لائن پار کرتی ہوئی عین سامنے ’عائشہ ہاؤس‘ کے لان میں ٹپے کھاتی جا رہی تھی۔

”وہ تو بے شک مار لیا ہے۔ اب ذرا یہ مار کھا کر بتاؤ۔“

نبیل نظروں سے گیند کا تعاقب کرتا رفعت کے جوش و خروش کو جھاگ طرح بٹھانے کے لیے اطلاعی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”واہ۔ گیند ہم کیوں لائیں۔“

وہ چمک کر بولی۔

”یہ تو گیم کا اصول اولین ہے جو چھکے چوکے کا شوقین گیند باہر پھینکے گا۔ وہی لانے گا۔“

ندرت نے انہیں انصاف کی پٹی پڑھائی۔

”لو۔ بھلا کب۔؟“

ارسل صاف مکر گیا۔

”بھائی۔“ نبیل نے خاصے تپے ہوئے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”اپنے تین سال بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ مت اٹھایئے اور یوں بھی اصول‘ اصول ہوتا ہے چاہے اس کی زد میں بڑا آئے یا چھوٹا۔“

”بالکل صحیح کہہ رہے ہیں نبیل بھیا۔ اور وہ بھی پہلی دفعہ۔“

زہرہ بی اپنی سانسیں بحال کرتی بحث و مباحثے کے مرکز کی سمت تشریف لا چکی تھیں۔

”ایسا ہے کہ۔“

ارسل کوئی چارۂ کار نہ پا کر سر کھجانے لگا۔

”یار اور تو کچھ نہیں مگر نانی محترمہ کی گھورتی ہوئی چار آنکھیں اور کڑکتا لہجہ۔“

وہ ان کی چشمے سے سجی آنکھیں اور دھاڑتا ہوا ترش لب و لہجہ یاد کر کے خاصا دہل گیا تھا۔ معاً اس کی نگاہ سامنے کے ٹیرس پر پڑی زرشہ بڑے انہماک سے ریلنگ پر کہنی ٹکائے ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھے ان کی طرف متوجہ تھی۔

شام کا ٹائم تھا۔ گھر میں انتہا درجے کی بوریت اور تنہائی محسوس

کرتے ہوئے وہ ٹیرس پر آ گئی تھی۔ یہاں سے سامنے والے لان پر نظر پڑی تو ان لوگوں کی دلچسپ اچھل کود نے نے اپنی سمت متوجہ کر لیا۔ بہت زیادہ واضح انداز میں تو سنائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اتنا ضرور جان گئی تھی کہ کسی اہم نوعیت کے فوری طور پر درپیش مسئلے کے حل کے لیے وہ لوگ گیم روک کر بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔

''اوہو۔!''

ارسل کا لہجہ خاصا اونچا تھا۔

''لوگ تو ورلڈ کپ میچز کی سی دلچسپی سے ہمارا گیم دیکھ رہے ہیں۔''

انداز صاف اسے سنانے کا تھا۔ باقی بہن بھائی بھی اس کی سمت متوجہ ہو گئے۔ وہ انہیں ادھر دیکھتا پا کر خفیف سی ہو کر پیچھے ہو گئی بلکہ نیچے اپنے لان میں چلی آئی۔

''بے چاری۔ اکیلے پن سے تنگ آ گئی ہو گی۔''

تمکین نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''کیوں نہ ہم انہیں بھی شامل کر لیں اپنے گیم میں۔''

ندرت کی تجویز پر سب اسے یوں گھورنے لگے گویا کوئی انتہائی انوکھی اور عجیب و غریب بات کہہ دی ہو۔

''دماغ تو ٹھکانے ہے ناں۔ وہ عائشہ بیگم کی جانشین۔ اور ہمارے

ساتھ کھیلیں گی۔''

رفعت نے ندرت کو یاد دلایا تھا۔

''اول تو نانی اسے آنے ہی نہیں دیں گی اور بالفرض اجازت دے بھی دیتی ہیں تو وہ محترمہ حسین ماہ جبین، نازنین ہمارے ساتھ مل کر کھیلنا کہاں پسند فرمانے لگیں۔''

اس کے لہجے میں طنز تھا۔

ندرت کا منہ لٹک گیا۔

مسئلہ اس وقت گیند لانے کا ہے خواہ مخواہ ٹائم کیوں ضائع کیا جا رہا ہے فضولیات اور فضول لوگوں پر۔''

ارسل نے یاد دہانی کرانا اپنا فرض اولین سمجھا تھا۔

''ٹائم ضائع کرنے کی تو بات ہی نہیں ہے بڑے بھائی۔''

نبیل نے آرام سے کہا۔

''گیند آپ کے ہاتھ سے پرواز کرتی ہوئی علاقہ غیر میں گئی ہے لہٰذا اب آپ ہی جا کر اسے واپس لائیں تو بات بنے گی۔''

''گویا گیند نہ ہوئی بیوی ہو گئی جو روٹھ کر اپنے میکے جا بیٹھی ہو۔''

ارسل نے خاصے غور و خوض کے بعد تپ کر کہا۔

بالآخر اسے جانا ہی پڑا۔ کھیل بھی تو جاری رکھنا تھا۔

"عائشہ ہاؤس"۔ کا گیٹ کھلا ہوا تھا' وہ ہلکے سے بجا کر اندر
آ گیا۔ لان میں ٹہلتی زرشہ نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا اور پھر
تیوریاں چڑھا کر پودوں کو پانی دیتے رشید سے مخاطب ہوگئی۔

"رشید خان۔!"

اس کے کڑکتے لہجے پر وہ کھرپی ہاتھ میں جوں کی توں لیے بھاگا چلا
آیا تھا۔

"ہاں جی۔ بی بی جی۔"

کیا یہاں کے لوگوں کو تمیز نہیں ہے بیل بجا کر گھر والوں کی اجازت
سے اندر داخل ہونے کی۔؟"

وہ ایک تند نگاہ ارسل پر ڈال کر بدستور گرجتے انداز میں رشید خان
سے پوچھ رہی تھی۔

"مجھے کیا پتا جی۔ یہ تو بندے بندے پر منحصر ہوتا ہے۔"

رشید خان دزدیدہ نگاہوں سے ارسل میاں کو دیکھتے ہوئے اپنی
لاچاری بیان کر رہا تھا۔

زرشہ جھلا کر رشید خان کو گھورنے لگے۔

"کبھی اپنی ذاتی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ کلثوم سے کہا کرو۔
عین دماغ کا نشانہ لے کر نہ داغا کرے اپنی گرگابی کا اسکڈ میزائل۔"

"اچھا جی۔ آپ کہتی ہیں تو ضرور کہہ دوں گا اسے کہ آئندہ احتیاط

کرے۔"

رشید خان نے فرمانبرداری سے سر ہلایا۔

وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔ ارسل نہایت اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے
ان کے مکالمات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"آپ مسٹر۔ کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ فوراً سے پیشتر چلتے
پھرتے نظر آئیں۔"

وہ رشید خان کو دل ہی دل میں ہزار گالیوں سے نوازنے کے بعد
اس کی سمت متوجہ ہوگئی تھی۔

آپ کا منہ اس لائق نہیں ہے کہ کوئی باشعور ذی فہم، صاحب عقل و
دانش اسے دیکھنے کے لیے آگ کا دریا پار کرے۔ دراصل ہماری گیند نہایت
بدتمیز اور بے لگام ہے۔ بغیر بتائے پوچھے منہ اٹھا کر ادھر چلی آئی۔"

وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"اسی کی تلاش میں تشریف آوری ہوئی ہے۔" اس نے مدعا بیان
کیا تھا۔

ایک تو کھڑے کھڑے اس کے حسن بے مثال کو دو کوڑی کا بتا رہا تھا
اور اوپر سے نہایت بے فکری سے گیند تلاش کرنے کے لیے ادھر اُدھر تاڑ
رہا تھا۔ وہ کباب ہی تو ہو چلی تھی۔

"نہیں ہے آپ کی گیند یہاں۔ اور اب نو دو گیارہ ہو جائیں۔"

اسی اثناء میں نانی چلی آئیں۔

''کیا ہو رہا ہے۔لڑکے تم یہاں کیسے ہو۔؟''

نانی عینک کی کمانی درست کرتی خراماں خراماں ادھر چلی آئی تھیں اور اب گرجتے ہوئے انداز میں اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔

''وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ۔''

عائشہ بیگم کو سامنے دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹنے لگے۔

''اب کیا آئیں بائیں شائیں لگا رکھی ہے۔''

نانی کی آمد پر زرشہ شیر ہو گئی تھی۔ بڑے پر جلال انداز میں کمر پہ ہاتھ ٹکا کر پوچھ رہی تھی۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے طوفان میل کی طرح زبان چل رہی تھی۔''

''اے ہاں اکیلی لڑکی پا کر زبان کی کترنی نہیں چلے گی تو اور کیا ہو گا۔''

نانی کی چشمے سے تنی ناک کے نتھنے مارے غصے کی بری طرح ابھرنے پچکنے لگے تھے۔''

''اور وہ بھی اتنی خوبصورت اور بھولی بھالی۔''

''لکڑی کے پنجرے میں بند کر کے رکھیے۔دیکھیے کہیں نظر نہ لگ جائے اس کوہ قاف سے اترے جنوں کو۔''

ارسل نے اعلا درجے کی گستاخی کا نہایت رسانیت سے مظاہرہ کر

ڈالا تھا نتائج و عواقب سے قطعی بے پروا ہو کر۔

نانی اور نواسی کے تو سر سے لگی اور تلووں پر بجھی۔

آپ جیسا بدتمیز اور بدلحاظ انسان میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا۔نہیں ہے کوئی گیند وید ہمارے پاس۔آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ فوراً سے پیشتر چلتے پھرتے نظر آئیں۔''

وہ غصے سے آگ بگولا ہوتے ہوئے اسے گیٹ کی طرف راستہ دکھا رہی تھی۔

''ارے نانہجار، بدزبان۔آخر اولاد کس کی ہو۔جیسی روح ویسے فرشتے۔باپ اور دادی کا اثر نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔''

نانی کی چشمے میں مقید نظروں کے ساتھ ساتھ لہجے سے بھی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ وہ تو خیر ہوئی ارسل موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے اپنی ''بمباری۔'' کے فوراً بعد سرک کر گیٹ کی طرف آ گیا تھا ورنہ وہ نانی نواسی تو شاید سچ مچ پنجے نکال کر اس کا خون پی جاتیں۔

گیند پر فاتحہ پڑھتا وہ واپس ''خدیجہ ہاؤس'' میں داخل ہوا تو اس کے ہمراہ بڑی چٹ پٹی داستان تھی حاضرین کو سنانے کے لیے۔

"ہونہہ۔ سمجھ رہے تھے بے چاری تنہائی کی ماری ہم سے مکس اپ ہونے کے بہانے تلاش کر رہی ہے۔ اب بتاؤں گی انہیں کہ ان کے بغیر بھی میں بوریت دور کر سکتی ہوں۔"

وہ دل ہی دل میں مکالمہ آرائی کر رہی تھی۔

اس دن جس طرح ان لوگوں نے کرکٹ کھیلتے ہوئے اسے حسرت و یاس کے عالم میں ٹیرس پر متوجہ کھڑے پا کر ہمدردانہ تاثرات دکھائے تھے اس نے اس کے اندر آگ سی لگا دی تھی۔ خصوصاً ارسل کی انتہا درجے کی گستاخی کے جواب میں اس پر جتانا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ سو جونہی شاہین آنٹی ویک اینڈ پر اپنے سات سالہ ٹونی اور نوجوان دیور کیپٹن عاطف کے ہمراہ آئیں اس نے عاطف اور ٹونی کو پکڑ لیا کرکٹ کھیلنے کے لیے۔

عاطف کے ساتھ یوں بھی اس کی اچھی خاصی بنتی تھی۔ لاابالی سے مزاج۔ شوخ بے فکرا سا حال مست مال مست ٹائپ بندہ تھا۔ کھیل کود اور ملے گلے کا یوں بھی شوقین تھا۔

"اور یہ چھکا۔"

وہ یکدم جوش سے اچھل پڑی تھی۔

"اور یہ گیند باؤنڈری لائن سے پار ہوتی ہوئی مشکوک گھر کے لان میں۔"

عاطف گیند کی اٹھان پر رواں تبصرہ کر رہا تھا۔

زرشہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"افوہ۔"

وہ سخت جھنجلا سی گئی۔

لازمی بات تھی اب اسے جانا پڑتا گیند لانے کے لیے۔ یہ تو پہلے سے طے شدہ امر تھا کہ جو بولے وہی کنڈی کھولے۔

وہ گھنی بیل کے سائے میں کین کی کرسی ڈالے ایک ہاتھ میں مگ پکڑے دوسرے سے فائل زانوؤں پر لٹکائے نہایت انہماک سے اپنے کام میں غرق تھا جب اوپر سے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والی گیند تیر کی طرح سیدھی اس کے مگ سے ٹکراتی چائے اور ٹوٹے ہوئے مگ دونوں کو اپنے ہمراہ لیتے ہوئے زمین کی آغوش میں جا پڑی۔

چائے کے کچھ چھینٹے اس کے تازہ تازہ نہا کر بدلے ہوئے سفید

کلف لگے شلوار قمیص پر اور کچھ انتہائی اہم نوعیت کی فائل پر جا پڑے تھے۔

''او شٹ۔''

وہ بھنا کر ہی تو رہ گیا تھا۔ اسی اثناء میں اسے وہ ادھ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔

اس نے بہ سرعت جھک کر گیند اٹھائی اور مٹھی میں لے کر ہاتھ ایک سائیڈ پر کرلیا۔

''ایکسکیوزمی۔ یہاں ہماری بال آئی ہے۔''

اس نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے قریب آ کر اطلاع دی تھی۔

''آپ کو نظر آ رہی ہے یہاں۔؟''

اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں الٹا سوال کیا۔ اپنے کپڑوں اور فائل کا حشر نشر دیکھ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔

''وہ تو نہیں البتہ اس کے ''کارنامے'' ضرور نظر آ رہے ہیں۔ جو تصدیق کرتے ہیں کہ بال ادھر ہی ہے کہیں۔''

وہ خاطر میں لائے بغیر فائل، مگ اور اس کے کلف لگے کپڑوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتی زور دے کر کہہ رہی تھی۔ وہ ٹشو پیپر سے فائل اور قمیص پر سے چھینٹے صاف کر کے جی جان سے کاغذات میں سر گھسیڑ کر بیٹھ گیا۔

''جائیں جائیں۔ اپنا راستہ ناپیں۔ یہاں کوئی اسپورٹس گڈز کی شاپ نہیں کھلی ہوئی۔''

اس کی انتہا درجے کی رکھائی کے مظاہرے پر وہ سلگ کر رہ گئی۔

''دیکھیے۔ ہماری گیند واپس کیجیے۔ ہماری گیم خراب ہو رہی ہے۔''

''ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا اس دن۔''

''تو گویا بدلہ لے رہے ہیں آپ۔''

وہ چیخ کر رہ گئی تھی۔

''سمجھ لیجیے۔''

وہ ہنوز کمال درجے کی بے مروتی سے اپنے کام میں سر دیے بیٹھا تھا۔

وہ پیر پٹخنے لگی۔''

کیا بدتمیزی ہے یہ۔ سیدھی طرح ہماری گیند واپس کیجیے۔''

وہ غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ سنی ان سنی کرتا ہوا نہایت سکون سے اٹھا اور فائل کے کاغذات سمیٹ کر اندر کی سمت روانہ ہو گیا۔ گویا واضح سگنل تھا کہ تم میری جان نہیں چھوڑ رہیں تو میں خود یہ نیک کام کر لیتا ہوں۔

انتہا درجے کی بے مروتی اور بدلحاظی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پیتے ہوئے دل ہی دل میں ہزار صلواتیں سناتی ہوئی ناکام واپس پلٹ گئی تھی۔

"دیکھ لوں گی میں بھی۔ بڑا آیا۔ ہونہہ۔"

اس نے نخوت سے اپنی ننھی سی ناک سکوڑی تھی۔

دوسری شام کی بات تھی جب زہرہ ہاتھ میں ایک پیکٹ کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔ گویا ان کے ایک دوسرے کے ملازمین کا آپس میں میل جول بھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا مگر بہرحال ضروری کام یا بات کے لیے ان ہی کا رابطہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یوں بھی زہرہ کو "کلو باجی" کی صحبت بڑی راس آتی تھی۔ اس سے نت نئے ڈیزائنوں کے کروشیے کی بیلیں اور نکرامے بنانا سیکھتی۔ دونوں کی آپس میں بڑی بنتی تھی۔ پہلے پہل تو دونوں اطراف سے (دادی اور نانی کے) اعتراضات کے پہاڑ کھڑے ہوئے تھے مگر پھر ان دونوں کی آپس کی جذباتی مگر بے ضرر محبت نے دونوں فریقین کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے گاہے بگاہے اب ان کی ایک دوسرے کے ہاں آمد کو سرسری خیال کیا جاتا تھا۔

"بی بی جی! یہ لیجیے جی۔"

زہرہ لان کے پودوں کو پانی دیتی زرشہ کے قریب آ کر بولی تھی۔

"یہ کیا ہے بھئی۔؟"

وہ حیرانی سے پیکٹ کو دیکھنے لگی۔

"یہ جی انہوں نے کہا تھا آپ کو دے آؤں۔"

وہ دے کر اُڑن چھو ہو گئی۔

"انہوں نے کس نے۔؟"

وہ ورطہ حیرت میں ڈوب گئی مگر جواب کون دیتا وہ تو ہوا ہو گئی تھی پل بھر میں۔

اس نے پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پیکنگ کی نزاکت کے اعتبار سے کوئی عمدہ سا گفٹ معلوم دے رہا ہے۔

"مگر کون بھیج سکتا ہے۔ مجھے اور کس موقع کے لیے۔" وہ بحرِ حیرت میں ڈبکیاں لگاتی نہایت تجسس کے عالم میں وہیں کھڑے کھڑے پیکٹ کھولنے لگی۔ ریپر کے نیچے اخباری کاغذ تھا۔ اس کے نیچے پھر اخباری کاغذ۔

"خدایا گفٹ کہاں دفن ہو گیا ہے ان کاغذات میں۔"

وہ ادھر اُدھر ٹٹول رہی تھی۔ بالآخر وہ تحفہ نمودار ہو ہی گیا پیکٹ سے۔

وہ ایک دم اچھل پڑی۔

"ارے۔"

یہ تو اس کی گیند تھی جو کل "خدیجہ ہاؤس" کے بدتمیز شخص ارسل نے واپس لوٹانے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ شدید غصے اور اشتعال کی لپیٹ میں آ گئی۔

"شٹ آخر محترم مجھے کیا جتانا چاہ رہے ہیں۔"

پہلے تو وہ غصے، خفگی اور اشتعال کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہلتی پیر پٹختی مٹھیاں بھینچتی دل ہی دل میں اس بدلحاظ شخص کو کوستی رہی پھر جیسے جیسے اُبال کم ہوتا گیا۔ غصے کی جگہ ہوش نے لے لی۔

''آ گئی ترکیب۔''

اس نے بالآخر خوش ہو کر چٹکی بجائی۔

اگلے دن کی بات تھی۔ کلثوم عرف کلو بی بی اپنے ہاتھ میں نہایت عمدہ سا گفٹ پیک لے کر خدیجہ ہاؤس کے لان میں فائلوں میں اُلجھے ارسل کے سامنے تھیں۔

''یہ کیا ہے بھئی۔؟''

وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ انداز میں تحیر آمیز تجسس تھا۔

''میں کیا جانوں جی' انہوں' نے دیا ہے۔''

کلو زرشہ کی ہدایت کے مطابق بے نیازی سے مبہم سے انداز میں جواب دے کر واپس پلٹ گئی تھی۔

ارسل نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پیکٹ کھولا۔ اخباری کاغذ کی بہت سی تہوں کے بعد اندر سے دو گیندیں برآمد ہوئیں۔ ایک وہی جو اس نے واپس کی تھی اور دوسری ان کی اپنی جس کی تلاش میں اس دن ''عائشہ ہاؤس۔'' گیا تھا۔

''ارے۔''

اس کی حیرانی ہنسی میں بدل گئی۔ وہ سمجھ گیا یہ اس کی شرارت کی جوابی کارروائی تھی۔ تب ہی اس کی نظر سامنے پڑی۔ زرشہ ٹیرس پر کھڑی گویا آنکھوں سے تماشا ملاحظہ کرنے کے لیے ادھر متوجہ تھی۔ ارسل کے دیکھ لینے پر خفیف تو ہوئی مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کمال بے نیازی سے ریلنگ پر کہنی ٹکا کر دور آسمان پر کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے کسی فلسفی اور ماہر نجوم کی مانند تفکر آمیز انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ گرج چمک کے ساتھ بارش چھاجوں کے حساب سے برس رہی تھی۔ دوپہر کے بعد ذرا دیر کو طوفانی بارش تھمی تو وہ سرخ مفلر اور جرسی میں تیار ہو کر نیچے آ گئی۔

''نانی! میں ذرا باہر جا رہی ہوں کل شام سے اس بور موسم کی وجہ سے گھر میں بند ہوں۔''

وہ چابیاں جھلاتی کاریڈور کی سمت بڑھی تھی۔

''اے ہے۔ بھلا اس بھری برسات میں کہاں چل دیں۔''

نانی نے فوراً ٹوکا۔

''کہاں۔ اب تو بارش تھم چکی ہے۔''

اس نے ان کی تسلی کرانا چاہی۔

''تمہیں یہاں کے موسموں کی کیا خبر۔''

نانی اپنی بات پر مصر رہیں۔

''یہ ذرا تھم کر دوبارہ برسے گی زور و شور سے۔''

''اس وقت تک آ جاؤں گی نانی جان بس ایک چکر لگا آؤں ادھر قریب کا۔''

وہ منت کے سے انداز میں اجازت طلب کر رہی تھی۔

مگر نانی متذبذب سی تھیں۔

''اے۔ انوکھے ہی مطالبات ہوتے تو ہیں تیرے۔ بھلا اتنی سردی اور ایسے شدید خطرناک موسم میں چرند پرند بھی اپنے ٹھکانوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ ایک تو بے آرام پڑی ہے جسے کسی کل چین ہی نہیں پڑتا۔ بھلا کیسے اجازت دوں باہر جانے کی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سڑکوں پہ اتنا پانی کھڑا ہے اتنی پھسلن ہے اور تجھے یہاں کی ٹریفک کا بھی کچھ اندازہ نہیں۔ روڈ سینس تو صفر ہے تیرا۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔''

نانی کا قطعی ارادہ نہیں تھا اسے اجازت دینے کا' مگر اس کی ضد پہ بالآخر بہت سی شرائط طے کر کے اس کی بات مان ہی لی۔

''زیادہ سے زیادہ بیس منٹ بعد واپس آنا ہے۔ اس ایریے سے باہر نہیں نکلنا۔ بازار یا مارکیٹ سائیڈ پر ہرگز نہیں جانا۔ گاڑی کی رفتار انتہائی ہلکی

رکھنا ہے اور گاڑی سے باہر نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اس سے تو بہتر تھا مجھے پولیس کی کمانڈ میں باہر بھیجا جاتا جیسے وہ پیشی کے لیے مجرم کو جیل سے عدالت تک بند حفاظتی گاڑی میں لے کر جاتے ہیں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔

ڈرائیو کے لیے نکلی تو جی نہیں چاہا اپنے ایریا میں چکر لگانے کو۔

"ٹائم تو ہے ناں ابھی۔"

اس نے گھڑی کی سوئیوں کی رفتار ملاحظہ کی۔

"جب گھومنا ہی ہے تو کھلی سڑک پر مزا لیا جائے۔"

اس نے گاڑی بازار کی جانب مین روڈ پر ڈال دی۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا۔ ڈیک مدھم سروں میں بج رہا تھا۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں ریش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ یہ اس کی کمزوری تھی۔ ہلکی رفتار سے گاڑی چلا ہی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے تو نانی خود ڈرائیو کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

"نانی کی ساری شرائط ہی چولہے میں ڈال دی ہیں۔"

اس نے انصاف کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود سے اعتراف کیا تھا۔

بیس منٹ تو کب کے ہو چکے تھے۔ اپنے ایریا سے بھی باہر تھی اور گاڑی کی رفتار بھی حسب معمول بہت تیز تھی۔

بالآخر شرائط کی خلاف ورزی کا نتیجہ اس کے سامنے آ گیا۔ گاڑی

ایک جھٹکے سے ایک بلند عمارت کے آگے بنے پانچ چھ فٹ اونچے لوہے کی پالش شدہ گول جنگلے سے ٹکرائی تھی۔ جنگلے کے اندر کوئی نایاب سا سرسبز پودا لگا ہوا تھا۔ شکر یہ تھا کہ اس نے قدرے ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بر وقت بریکوں پر پاؤں رکھ دیے تھے۔ اس لیے بہت زیادہ نقصان ہونے سے بچ گیا۔ گاڑی کے ٹائر کے چرچرانے کی آواز اس سناٹے میں دور تک گونج کر رہ گئی تھی۔ یہ کمرشل ایریا تھا مگر بیشتر شاپنگ پلازہ اور دیگر دفاتر میں انسانی وجود ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتا تھا۔

جنگلے سے ٹکر کھا کر اس کی توڑتی قیمتی پودے کو شہید کرتی اس کی اکینو برائٹ نے اپنی ہیڈ لائٹس کی قربانی دے کر عجیب بے ڈھب سے ترچھے انداز میں سکھ کا سانس لیا تھا۔

ادھر اس کی سانسیں اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگر اپنے حواس بحال نہ رکھے ہوتے تو شاید اب تک بے ہوش ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آدھ ہڈی ضرور فریکچر کروا چکی ہوتی۔ یہ الگ بات تھی کہ بہت بہادری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کی جان پہ بن آئی تھی۔

بے ساختہ دھڑ دھڑ کرتے خوفزدہ دل پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"خدایا۔ اب کیا کروں۔"

اپنی بے وقوفی۔ بے بسی اور نافرمانی پر بہت سا رونا آ رہا تھا۔

"یہ ہوتا ہے انجام بزرگوں کی بات نہ ماننے اور اپنی سی کر گزرنے کا۔"

وہ نہایت ایمانداری سے اپنا قصور تسلیم کر رہی تھی۔

اس قدر تیز بوچھاڑ کے ساتھ تڑاتڑ بارش برس رہی تھی کہ اس طوفان میں گاڑی سے باہر قدم نکالنے کا تصور ہی ریڑھ کی ہڈی تک میں برفیلی لہر دوڑا دیتا تھا۔

"یونہی کب تک بیٹھی رہوں گی۔ کچھ ہاتھ پیر تو چلانے ہی پڑیں گے۔"

وہ دل کو مضبوط کرتے ہوئے سلیف میں چابی گھمانے لگی۔ بہتری کوشش کی سر پٹخا۔ دماغ لڑایا۔ ہاتھوں پاؤں کا استعمال کیا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

"اب کون اُتر کر دیکھے کیا خرابی ہوئی ہے۔ انجن میں۔"

وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

ایسے میں رحمت کے فرشتے کی طرح اسے، سامنے کی تین منزلہ عمارت سے ایک وائٹ ٹیوٹا کریسڈ کی جھلک دکھائی دی۔ گاڑی اسی سمت بڑھ رہی تھی۔

اس نے برق رفتاری سے شیشہ گرا کر ہاتھ باہر نکال کر ہلایا تھا۔

بالآخر گاڑی اس کے قریب آن رکی ڈرائیور نے شیشہ آدھا گرا کر

استفہامی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

بات سنیے جی۔ میری گاڑی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ آپ کچھ میری مدد کر سکتے ہیں؟ مثلاً کسی آٹو ورکشاپ سے مکینک کو بلوا دیں۔"

ڈرائیور نے متذبذب سا ہو کر پیچھے دیکھا تھا متفسرانہ نگاہوں سے۔

"چلو خدا بخش! ترس کھا کر دے ہی دو بے چاری کو لفٹ۔ کیا یاد کریں گی۔"

یہ لہجہ۔ یہ لہجہ۔ بندوق کی گولی کی طرح اس کے اعصاب پر لگا تھا۔ اس نے جلدی میں پیچھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ تب ہی معاً سامنے کی بلڈنگ پر نظر پڑی۔

"ایاز بلڈرز۔"

گویا یہ اس کا آفس تھا۔

"مہربانی شکریہ مجھے ہمدردی کی بھیک کی ضرورت نہیں۔" اس نے چیخ کر جواب دیا تھا۔

محترمہ! ہر جگہ صورت کا جادو کام نہیں آتا۔ عقل کی مارکیٹ ویلیو بہت بڑھ گئی ہے۔ اگر آپ اور آپ کی نانی محترمہ کو یقین نہیں ہے تو کسی دن خود تجربہ کر کے دیکھ لیں لیکن اس تجربے کے لیے پہلے عقل کے ناخن لینا

ضروری ہوتے ہیں۔

اس کا بظاہر رواں، سادہ اور پرسکون انداز اپنے اندر کتنی تلخی اور زہریلا پن سمیٹے ہوئے تھا اس کا اندازہ زرشہ کو واضح طور پر ہو رہا تھا۔

''آپ اپنے جامے میں رہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

وہ جل بھن کر بولی تھی سمجھ گئی تھی۔ وہ در پردہ اس کے ایسے خطرناک موسم میں ڈرائیو کے لیے باہر نکلنے پر ملامت کر رہا تھا۔

''بہتری اور بدتری کی پیمائش کے پیمانے سے ''عائشہ ہاؤس'' کے لیے لوگ بڑی مدت ہوئی ہاتھ دھو چکے ہیں۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے اطلاع دی تھی۔ انداز میں عجیب سی تندی اور تمسخر تھا۔

وہ بھڑک کر انگارہ ہی تو بن گئی۔

آپ کو میرے ساتھ اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔''

''حق حقوق کی باتیں ان کے منہ پر سجتی ہیں جو لینا اور دینا دونوں جانتے ہوں۔ جہاں صرف اور صرف لینے پر ہی زور ہو، وہاں انصاف کا ترازو نہیں چلتا۔''

بڑا برفیلا انداز تھا اس کا' موسم سے بھی زیادہ ٹھنڈا۔

''کیا لیا ہے ہم نے آپ سے۔؟''

وہ آتش زیر پا ہو رہی تھی۔

''آپ دے ہی کیا سکتے ہیں ہمیں ہونہہ۔ جانے خود کو کون سا حاتم طائی سمجھ بیٹھے ہیں۔''

''بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت آپ میں ہوتی تو مدتوں پہلے جان چکی ہوتیں کہ خدیجہ ہاؤس والوں نے کیا کیا کچھ آپ لوگوں کو دان کر دیا ہے۔ بہرحال فی الوقت اس بحث کا موقع نہیں۔ تشریف لے آئیے میں گھر ہی جا رہا ہوں۔''

ہونہہ۔ مائی فٹ۔''

اس نے نتائج و عواقب کی پراوا کیے بغیر بے دردی سے اس کی آفر ٹھکرا دی تھی۔''

پہلے اگر چلی بھی جاتی تو اب نہیں جاؤں گی قیامت تک سنبھال کر رکھیے اپنی ہمدردی کی پوٹ۔ آگے کام آئے گی۔''

اس کے کمال درجے کی نخوت آمیز لہجے پر ارسل کو اپنا غصہ اور اشتعال ضبط کرنا دشوار محسوس ہونے لگا تھا۔ مگر پھر بھی انسانیت کی جون میں بولا۔

''خوامخواہ ضد نہ کریں۔ یہاں آپ کو اس وقت کوئی موٹر مکینک نہیں ملے گا۔ سب دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ کسی قسم کی ٹرانسپورٹ ملنے کی توقع بھی عبث ہے کچھ دیر میں شام گہری ہو جائے گی۔ یہاں اکیلے اس لاچاری کی حالت میں کب تک بیٹھی رہیں گی۔''

اس کے حقیقت پسندانہ انکشاف نے اندر ہی اندر اسے ہولا کر رکھ دیا
تھا مگر ضرورت اور مصلحت کے آگے ضدی انا کے پردے حائل ہو گئے تھے۔

''جائیں جائیں مسٹر! اپنا راستہ ناپیں۔''

اس نے ہونٹ بھینچ کر شیشہ اوپر چڑھا لیا تھا۔ ارسل کے اشارے
پر واقعی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا لی۔

اس نے تھکے تھکے کھنچے ہوئے اعصاب سمیٹے اور سیٹ کی پشت سے
ٹیک لگا لی۔

''اب کیا کرنا چاہیے۔''

کتنی ہی دیر سوچوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے کے باوجود جب
اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے زاری کے عالم میں آنکھیں کھول دیں۔

ماحول پر چھایا سناٹا اس کی سٹی گم کرنے لگا۔

''اس طرح کب تک بیٹھی رہوں گی بے یار و مددگار۔''

وہ صحیح معنوں میں ہراساں ہو گئی۔

اب تو ارسل کو گئے بھی پون گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔''

اللہ جی۔ کہاں پھنس گئی۔''

اس نے ماتھے پر بے قراری سے ہاتھ رکھا تھا۔

''اس سے تو بہتر تھا۔ اس کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ اب تک پہنچ بھی

چکی ہوتی اور ہیٹر کے آگے کمبل میں بیٹھ کر گرم گرم چائے پی رہی ہوتی یہاں
چوہے دان میں تو نہ پھنسی ہوتی۔ ہائے کاش چلی ہی جاتی۔ خواہ مخواہ ضد
باندھی۔'' اسے پچھتاوے ستانے لگے۔

''یہاں کون آنے والا ہے میری مدد کو۔ اگر یونہی رات ہو گئی تو۔''

اندیشوں کے ناگ دماغ میں پھن پھیلائے سرسراتے پھر رہے تھے۔

اسی اثناء میں ریڈ سوزوکی ایک جھٹکے سے رکی اور اس میں سے نیلی
جینز والا بندہ بہ سرعت نکل کر بارش سے بچتا بچاتا تیزی سے اس کی سمت آ کر
ڈرائیور سیٹ کا شیشہ بجانے لگا۔

''عاطف۔''

پہلے تعجب اور پھر مسرت نے اسے گنگ سا کر ڈالا۔

''جلدی آؤ بھئی۔ ورنہ بھیگ جاؤ گی بری طرح۔ توبہ کیا غضب کی
بارش ہو رہی ہے۔ تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا اس خطرناک موسم میں تنہا
باہر نکلنے کا۔''

اسکے لیے دروازہ کھول کر وہ تیزی سے دوسری سمت سے ڈرائیونگ
سیٹ پر براجمان ہو کر ٹھنڈے یخ برف ہوتے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر
مالش پیدا کر رہا تھا۔

''اف اللہ۔''

شکر ہے خدایا۔ عاطف تم نہ آتے تو شاید کچھ دیر بعد میرا ہارٹ
فیل ہو جاتا۔"

اس نے زور سے آنکھیں میچ کر کھولی تھیں۔"

لیکن گاڑی کا کیا ہوگا۔"

"فی الحال گاڑی کی نہیں اپنی جان کی خیر مناؤ۔"

وہ روڈ پر گاڑی ڈالتا دھیان سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب کل ہی کچھ ہو سکے گا۔ تم نے اچھی طرح لاک تو کر دی تھی ناں۔"

"ہاں ہاں۔ اچھا یہ بتاؤ نانی زیادہ غصے میں تو نہیں تھیں۔"

اس کی بات کا جواب دے کر وہ تشویشناک انداز میں پوچھنے لگی۔

"تاکہ پہلے سے خود کو ذہنی لحاظ سے تیار کرلوں ان کی زبردست
تواضع برداشت کرنے کے لیے۔"

"میں کیا جانوں۔"

اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

"ہیں۔ تو کیا تمہیں نانی جان نے نہیں بھیجا۔"

زرشہ کو اعلا درجے کا تعجب لاحق ہو گیا۔

"نانی۔!"

وہ ہنسا۔

"ارے نہیں بھئی مجھے تو ارسل بھائی نے فون کر کے تمہارے
ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتا کر تمہیں پک کرنے کے
لیے کہا تھا۔"

"ارسل۔؟"

وہ دھک سے رہ گئی۔ مگر۔ وہ۔"

"ہاں بھئی۔ انہوں نے ہی اطلاع کی تھی۔"

اس نے موڑ کاٹتے ہوئے لاپروائی سے بتایا۔

تو گویا نانی کو خبر نہیں ہوئی تھی اس کی حماقت کی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی
نانی نے عاطف کو اس کی تلاش میں بھیجا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک حیرت میں غوطہ
زن رہی۔ یقین جو نہیں آ رہا تھا۔ ارسل اتنی ہمدردی کر سکتا ہے اس کے
ساتھ؟ ارسل کیا خدیجہ ہاؤس کے کسی بندے سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی
تھی۔ گھر آ کر نانی کی ڈانٹ سننے کے دوران بھی وہ یہی سوچتی رہی تھی۔
آخر ارسل نے اتنی انسانیت کا مظاہرہ کیونکر کیا۔

''ہیلو۔ بھئی کیا مصیبت ہے۔ کچھ منہ سے پھوٹیے بھی۔''

مسلسل چار بار ہیلو کرنے کے باوجود جب دوسری طرف خاموشی رہی تو وہ جھنجھلا کر تقریباً برس ہی پڑی۔

جواب میں ہلکے سے گلا صاف کرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ گویا موصوف بات کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

''چلیے۔ آپ کا انتظار ختم کروا دیتے ہیں۔ کہیے مزاج شریف کیسے ہیں۔؟''

آواز سن کر وہ اُچھل ہی تو پڑی۔

''تو یہ آپ موصوف تھے۔''

اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگی تھیں۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے۔؟''

دوسری طرف سے نہایت شرافت سے پوچھا گیا تھا۔ انداز ایسا تھا گویا ازل و ابد سے آپس میں محبت و یگانگت کا رشتہ رہا ہو۔

''میری طبیعت کو کیا ہونا تھا۔''

وہ جھلائی۔

''چلیے پھر میری پوچھ لیجیے۔''

اس نے جیسے صلاح دی۔

''میں ٹھیک نہیں ہوں۔''

''تو پھر میں کیا کروں۔ جائیے کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔''

وہ تنک کر بولی۔

''وہ ایسا ہے کہ ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے تو۔''

''گدھے ہوں گے آپ خود۔ ایڈیٹ۔''

اپنی شان میں کی گئی اس گستاخی کو ہضم کرنا اس کے لیے کیسے ممکن ہوتا۔ بھنا کر فون پٹخ دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فون بجنے لگا۔ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کوئی توجہ نہ دی مگر تا بکے فون۔ مسلسل بجتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اوپر سے نانی کی با آواز بلند ڈانٹ سنائی دی۔

''اے زری۔ کیا بہری ہوگئی ہو۔ میرے اوپر بیٹھی کے کانوں میں

دراخ ہونے لگا ہے اور تمہیں سرہانے بیٹھے اس کی آواز نہیں کان پڑ رہی۔

کہاں غرق ہوگئی ہو آخر۔"

اُسے صوبا دکر با اٹھنا ہی پڑا۔

"کیا تکلیف ہے آپ کو۔؟"

وہ ماؤتھ پیس میں دھاڑی تھی۔

"ارے، ارے۔ خیریت تو ہے زرشہ بھئی یہ کون سا طریقہ ہے فون

بند کرنے کا۔"

دوسری طرف سے شاہین خالہ نے اس کی خبر لی۔

"اووف۔"

وہ دانتوں تلے زبان داب کر رہ گئی۔ اور جو نانی کو خبر ہو جاتی تو وہ

ہاں لیتیں کہ یاد ہی رہتا۔

"سوری خالہ! میں سمجھی۔ کوئی اور ہے۔ اور سنائیں آپ کیسی ہیں۔

نی کیسا ہے۔ آپ آئیں ہی نہیں اتنے دنوں سے ادھر۔"

اس نے انہیں ادھر اُدھر کی باتوں میں لگایا۔

فون رکھ کر وہ پلٹی ہی تھی کہ پھر بج اٹھا۔

"کیا پھر کوئی بات یاد آ گئی شاہین خالہ کو۔"

اُسے خاصی الجھن ہوئی۔

"ہیلو۔"

اس نے نہایت شرافت اور ملائمت سے آغاز کیا تھا۔

"وعلیکم ہیلو۔ جیتی رہیے۔"

دوسری جانب سے بڑے خلوص سے اسے دعاؤں سے نوازا گیا تھا۔

اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ "کیا مصیبت ہے کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں

آپ میرے۔"

"پیچھے اور آپ کے۔"

دوسری طرف سے استہزائیہ ہنسی ابھری۔

"محترمہ نانی سمیت آپ کی خوش فہمی ابھی تک بحال ہے خیر اس

میں آپ لوگوں کا کیا قصور۔"

"کیا ان باتوں کے لیے زحمت دی جا رہی ہے۔"

اس کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔

"تم سے دراصل ایک کام تھا۔"

وہ انسانیت کی جون میں آ گیا۔

"کیسا کام۔؟"

وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں دریافت کر رہی تھی۔

"اور میں تمہارا کام کیوں کرنے لگی۔"

اس نے کوئی لحاظ روا نہیں رکھا تھا۔

''کام تمام کرنے والا کام نہیں ہے فکر نہیں کرو۔ اور جہاں تک 'کیوں' کا سوال ہے تو محترمہ میں نے بھی تو آپ کا کام کیا تھا۔ آپ کی ذات پر اتنا بڑا احسان کیا تھا۔''

''میری ذات پر احسان اور وہ بھی آپ نے کیا۔''

وہ استہزائیہ ہنسی

''کیا محترم ارسل ایاز خواب میں مخاطب ہیں۔''

''ذرا یاد کرو جب بھری برسات میں تم گاڑی کا ایکسڈنٹ کروا بیٹھی تھیں۔ اور میں نے تمہاری نانی کو ہوا تک بھی نہیں لگنے دی تھی اس واقعے کی۔ انہیں بس اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ عاطف لوگوں کے ہاں ہے اور تھوڑی دیر بعد آ رہی ہے۔ پھر عاطف کو فون کر کے تمہارے پاس بھیجا تھا۔ سوچو اگر عاطف نہ آتا تو اس ویران سنسان جگہ پر بے یار و مددگار بیٹھے بیٹھے تمہارا کیا حال ہوتا۔''

''میں نے کوئی ہاتھ پاؤں نہیں جوڑے تھے مدد کرنے کے لیے۔''

وہ احسان مانے بغیر تڑخ کر بولی تھی۔ ''خود ہی ہیرو بننے کا شوق چرایا تھا۔''

''تب تو خیر ایسا ارادہ نہیں تھا۔ مگر اب شاید بننا ہی پڑے۔ کیا خیال ہے اصل حقیقت نانی جی کو بتا دوں اس دن کی۔''

''اُف اللہ۔''

وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

کم بخت کس قدر دیدہ دلیری سے بلیک میل کر رہا تھا۔

''اچھا بولیے۔ بکیے کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ آپ پر۔''

مارے باندھے اسے پسپا ہونا ہی پڑا تھا۔

''پہلے تھوڑا سا کول ڈاؤن تو ہو جاؤ۔ بتائے دیتے ہیں۔''

جواب میں نہایت سکون کے عالم میں ایک طویل سانس چھوڑی گئی تھی۔

زرشہ ہونٹ کاٹتے ہوئے خون کے گھونٹ پی کر چپ کھڑی اس کے بولنے کی منتظر رہی۔

''وہ ایسا ہے کہ ان دنوں دادی جان کے جبر کی چکی میں پس رہا ہوں۔ ان کی شہ پر سب گھر والے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ بلکہ جان کو آ گئے ہیں جسے دیکھو میری شادی کرانے کے لیے جان سے گزر جانے کو تیار بیٹھا ہوا ہے۔ ہر آئے گئے کے سامنے یہی گرما گرم موضوع لے کے بیٹھ جاتے ہیں۔ میری جان ضیق کر کے رکھ دی ہے انہوں نے۔ راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام ہو گیا ہے۔ کوئی میری سننے کو تیار نہیں ہے۔ لہٰذا تم سے مودبانہ گزارش ہے کہ کسی طرح دادی جان کے دل سے یہ خیالِ بد رفع کر دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔''

''بھئی اتنی سی بات تم خود کیوں نہیں بتا دیتے دادی بی کو۔''

ارسل کی داستانِ غم نے کچھ ایسی گداز کیفیت اس کے دل میں پیدا کر دی تھی کہ وہ سابقہ مخاصمانہ تعلقات کو یکسر فراموش کر گئی تھی اور بے حد خلوص اور سچائی سے اس کو مشورے سے نوازا تھا۔

"کہاں سنتا ہے کوئی میری۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ایسا کرو تم کہہ دو کہ میں نہیں اور انٹرسٹڈ ہوں۔"

زرشہ نے ایک اور تجویز پیش کی۔

"وہ نہیں کی کون ہے لاؤ سامنے پھر۔؟"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔"

ارسل کا خدشہ اس کے بھی دل کو لگا۔

"اچھا ایسا ہے ارسل! کہ فی الحال تو کوئی حل میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔ رات کو سکون سے اس مسئلے کے بارے میں سوچوں گی پھر کل تمہیں کچھ بتا سکوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ بلکہ کل تم ادھر ہی چلی آنا۔ مل کر دماغ لڑائیں گے۔ شاید کوئی حل سوجھ ہی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ او کے ڈن۔ خدا حافظ۔"

اگلے دن لان کے سرسبز اور قدرے پرسکون گوشے میں وہ دونوں

سر جوڑے مسئلے کا حل تلاش کر رہے تھے۔

"کیا مصیبت ہے۔ تمہیں کوئی حل پسند ہی نہیں آتا۔ دو سو اٹھانوے حل بتا چکی ہوں اب تک۔"

بالآخر وہ بگڑ گئی تھی۔

"سارے مشورے اتنے بوگس اور پھسپھسے بھی تو ہیں۔ نہیں چل سکتے ہیں اس طرح کے حل۔"

ارسل نے سمجھانے والے انداز میں سر ہلایا۔

"میرے نزدیک تو یہی درست ترین حل ہے کہ تم دادی سے کہو تمہارا کسی سے چکر تھا پھر وہ لڑکی کہیں کھو گئی۔ تمہارے پاس اس کا ایڈریس فون نمبر وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا چنانچہ دوبارہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب جب وہ لڑکی مل جائے گی تو شادی کر لوں گا۔ سارا قصہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

"اچھا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"غور کرنا پڑے گا کہ چل سکتا ہے کہ نہیں۔ ویسے کافی حد تک معقول تو لگ رہا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تم۔ نکال لو نقص اس میں سے بھی۔"

وہ چڑ کر بالآخر ھسرتے ہوئے بولی تھی۔

"وہ تو دیکھا جائے گا۔ ویسے گھورا مت کرو ذرا۔ وگرنہ میں بھی گھور سکتا ہوں۔ یوں۔"

اس نے بھی اسی کے سے انداز میں جواب دے کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو آناً فاناً جیسے کوئی کوندا سا لپک گیا۔ عین اسی وقت نبیل کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے ڈیک پہ لگا گانا پوری آواز سے فضا میں گونجنے لگا۔

دیکھا تمہیں تو دل بے قرار ہوگیا
پہلی نظر میں تم پہ دل نثار ہوگیا
اے جان جاناں مجھ کو تم سے پیار ہوگیا

ایک لمحہ ہی آیا تھا دونوں کے بیچ مگر اس ایک لمحے نے دونوں کی ماہیت قلب بدل کے رکھ دی تھی۔ ارسل کی شوخ چمکیلی آنکھیں اس کے خوابناک چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اور زرشہ کی نگاہیں، ان کی وارفتہ چمک سے بوکھلا کترا کر جھکتی چلی گئی تھی۔

"حاضرین۔ چائے حاضر ہے۔"

نگین ٹرے گھاس پر رکھتے ہوئے دھم سے ان کے قریب بیٹھی تو ان کی بے خودی بھی جیسے ٹوٹ کر ہوش مندی میں تبدیل ہوتی گئی۔

"لائیے۔ چائے۔ چاہ کے ساتھ۔"

ارسل نے بڑے دلفریب انداز میں مسکرا کر زرشہ کی سمت دیکھا تھا۔

"ہاں پھر تم کیا بتا رہی تھیں۔ کون سا ساحل آزمانا چاہیے۔؟"

نگین جمیلہ خاتون کی بلانے پر اندر کی سمت بڑھی تو ارسل نے زرشہ سے دریافت کیا۔ انداز میں ایک نامعلوم سی ملامت رچ گئی تھی۔

"دیکھ لو۔ جو بھی مناسب لگے۔"

وہ چائے کا کپ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے لہجے میں دھیمی سی جھجھک در آئی تھی۔

"بیٹھو ناں۔ کہاں چل دیں۔"

"نانی انتظار کر رہی ہوں گی۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔"

جانے کیوں وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کا سامنا کرنا بہت دشوار اور کٹھن مرحلہ محسوس ہو رہا تھا۔ خصوصاً اس کی بولتی ہوئی شفاف گہری بھوری آنکھیں جیسے اپنے وجود کے روئیں روئیں میں حرارت پھیلاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ارسل کچھ سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔

''اے اچھی طرح دیکھ لیجیو۔ ساری چیزیں رکھ لی ہیں ناں۔''

دادی بی نے کوئی تیسری دفعہ جمیلہ خاتون کو یاددہانی کرائی تھی۔

''فکر نہ کریں دادی بی۔ آدھا بکرا پورے کا پورا سامان میں محفوظ ہوگیا ہے۔'' نبیل نے ان کی تسلی کرائی تھی۔

''چپل کباب بنانے کے رکھ لیے تھے جمیلہ۔''

دادی بی کی تسلی نہیں ہورہی تھی۔

''جی بالکل۔ اور اتنی وافر مقدار میں ہیں کہ بوقت ضرورت برسائے بھی جاسکتے ہیں۔''

نبیل نے پھر دخل درمعقولات کی تھی۔

''اے تجھ سے کون پوچھ رہا ہے۔ خواہ مخواہ میں ٹانگ اڑا رہا ہے۔

دادی کچھ کھسیا کر اس پر بگڑی تھیں سب جانتے تھے کہ دادی بی کھانے پینے کی بہت شوقین تھیں۔ خصوصاً خصوصی مواقع پر ان کی بھوک زوروں سے چمک اٹھتی تھی۔

یہ بقر عید کا دوسرا دن تھا۔ ان لوگوں نے پروگرام بنایا تھا کہ دوسرے دن حنالیک پر پکنک منائیں گے۔ اس لیے کل سے ہی تیاریاں عروج پر تھیں، وہ لوگ تو یوں تیار ہوئے تھے گویا آج ہی عید ہو ان کی۔ ایاز صاحب اپنی مصروفیات کے سبب اس پروگرام میں شریک نہیں ہوسکتے تھے انہوں نے آفس سے ٹویوٹا ہائی ایس بھجوادی تھی۔

خدا خدا کرکے یہ قافلہ اپنی منزل کو روانہ ہوا۔ راستے میں خوب زور وشور سے گانے بجانے کا مقابلہ ہوا سبھی کے دل شوخی وشرارت سے لبریز تھے۔ شاداں وفرحاں جھیل کنارے پہنچے۔ اردگرد پھیلے وسیع سبزہ زار پر ڈیرہ جما کر بھی جھیل کی سیر کا پروگرام سیٹ کیا جارہا تھا کہ دفعتاً نبیل کی نظر کچھ دور پرے کشتی میں سیر کرتی عائشہ بیگم، شاہین، ٹونی اور زرشہ پر پڑی۔ جھیل کے سبز پانیوں پر کشتی ایک تواتر سے تیر رہی تھی۔ اور سوار ٹھنڈی ٹھنڈی لطیف ہوا کا لطف بھرپور طریقے سے اٹھا رہے تھے۔

''ارے بھئی، وہ دیکھو۔''

اس نے دوسروں کی توجہ اس سمت مبذول کروائی۔ سب نے چونک کر دیکھا تھا۔

''اے لو۔ آ پہنچیں۔ یہ محترمہ رنگ میں بھنگ ڈالنے کو۔''

دادی بی کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

''بھلا ان کو کیسے خبر ہو گئی کہ ہم لوگ بھی آج نکلے ہوئے ہیں۔''

دادی کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

ادھر عائشہ بیگم بھی ان کی فیملی کو دیکھ چکی تھیں۔

''چلو جی۔ ہو گئی چھٹی۔ غارت ہو گئی ساری سیر و تفریح۔ بھلا ان کو کس نے اطلاع دی۔''

جواب میں زرشہ دھیمے انداز میں مسکرا دی تھی۔ ابھی عید سے چند روز پہلے ہی تو باتوں باتوں میں اس نے ارسل کو بتایا تھا۔ کہ عید کے دوسرے روز وہ لوگ جتالیک پکنک کے لیے جائیں گے۔ گویا ارسل نے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی فیملی کے ساتھ پروگرام بنایا تھا۔

''خدیجہ نے اچھے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں ہمارے پیچھے۔''

نانی کی پیشانی پر بہت سے ناگوار بل پڑ گئے تھے۔

''جھٹ سے خبر ہو جاتی ہے کہ دو گھڑی کو ہم سکون چین سے بسر کرنے کے لیے کہیں نکلے ہیں اور آ پہنچتی ہیں منہ اٹھائے۔''

وہ تنفر آمیز انداز میں بڑبڑا رہی تھیں۔

''چلیں چھوڑیں نانی۔ کیوں موڈ آف کرتی ہیں ہم نے کون سا ان کے ساتھ مل کے تفریح کرنی ہے۔ آپ پرواہ ہی نہ کریں۔ کوئی نوٹس ہی نہ لیں ان کی موجودگی کا۔''

زرشہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔ پھر دھیان بٹانے کو پوچھنے لگی۔

''کیا خیال ہے، ادھر نہ چلیں پہاڑی پر۔؟''

اس نے جھیل کے عین بیچوں بیچ بنائی پہاڑی کی سمت اشارہ کیا۔ پھر ان کی رضا جان کر ملاح کو اس سمت کشتی موڑنے کا کہہ دیا۔ اسی دوران ارسل وغیرہ بھی دو کشتیوں میں سوار ہو کر جھیل کی سیر کے لیے میدان میں آ چکے تھے۔ ان کا رخ بھی پہاڑی کی سمت تھا۔ پہاڑی کے اوپر پارک بنا ہوا تھا۔ سنگی بینچ لگے ہوئے تھے۔ تاہم ابھی تک کوئی اور شخص انہیں ادھر نظر نہیں آیا تھا۔ عید کی چھٹیوں کے باعث زیادہ تر لوگ اپنے گھروں میں یا تو مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہے تھے یا مہمان داری نبھا رہے تھے۔

''دھیان سے دیکھ کر چڑھنا چڑھائی۔''

کشتی کنارے لگی تو نانی نے خاص طور پر زرشہ کو تاکید کی۔

''یوں بھی تجھے اندھوں کی طرح چڑھنے اترنے کی عادت ہے۔''

ایسا نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

اوپر جانے کے لیے بل دار راستے بنے ہوئے تھے۔ اونچائی خاصی زیادہ تھی اور گرنے کے چانسز بھی بہت تھے۔ ادھر دادی لوگوں کی فیملی بھی پہاڑی کی سمت **"لنگر انداز"** ہونے کو تھی۔

"اف اللہ۔ سانس پھول گیا میرا تو۔"

تھوڑی سی چڑھائی کے بعد زرشہ تو ہانپنا شروع ہو گئی۔

"ہائے آپی! میں تو بالکل نہیں تھکا۔"

زرشہ پر ایک افسوس ناک نظر ڈال کر ٹونی میاں نے نہایت فخریہ انداز میں اطلاع دی تھی۔

"ارے بھئی، چڑھائی چڑھنا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔"

زرشہ کے چہرے پر تھکن اور کوفت کا پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ نانی اور شاہین خالہ خاصی مسافت طے کر چکی تھی۔

اور پھر ہونی ہو کر رہی۔ کافی سے زیادہ بلندی طے کرنے کے بعد ایک لمحے کو وہ سانس درست کرنے کے لیے رکی۔ ایک جھٹکے سے منہ پر آنے والے سرمئی چمکیلے بالوں کو پیچھے کرنے کی کوشش کی۔ ٹھیک اسی لمحے ایک زبردست چکر آیا۔ اور پھر جیسے زمین و آسمان سے گھومتے محسوس ہوئے۔ توازن بگڑا اور انہی اکھڑتے قدموں سمیت وہ نیچے آ رہی۔

نیچے گیا تھا۔ جھیل کا سبز گہرا پانی اسے اپنی آغوش میں لینے کو بیتاب تھا۔ خوف کی شدت سے بے ہوش ہوتے ہوئے اس کے ذہن میں آخری احساس بس اتنا تھا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے پانی کی پرسکون سطح چھونے سے قبل اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو بہت مختلف سچویشن میں پایا۔ اس کے اردگرد بہت سے چہرے جھکے ہوئے تھے۔ نانی شاہین ٹونی اور عاطف کے علاوہ ارسل، دادی بی جمیلہ خاتون، اور دوسرے سب فکرمندی سے اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

دھیرے دھیرے پپوٹوں کو مسلتے ہوئے اس نے ایک تکلیف دہ احساس کے ساتھ جسم کو حرکت دینا چاہی مگر کراہ کر رہ گئی۔

"لیٹی رہو۔ آرام سے۔"

بہت سی آوازیں اور ہاتھ اس کی حرکت کے جواب میں اس کے کانوں اور بازو سے چھوئے تھے۔

"کتنی دفعہ کہا ہے زری! دیکھ کے چلا کرو بچے دھیان سے۔"

نانی کی بھیگی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے بچاؤ ہو گیا ہے۔"

دادی بی کا فکرمندانہ لہجہ اس کے لیے بڑا نامانوس سا تھا۔

"اگر ارسل عین ٹائم پر پیچھے سے تھام نہ لیتا تو۔"

شاہین خالہ نے جھری جھری سی لی تھی۔

"بچانے والی تو اللہ کی ذات ہوتی ہے بیٹی! انسان تو صرف وسیلہ بنتا ہے۔"

جمیلہ خاتون نے بڑے مشفق۔ انداز میں خالہ کی تسلی کرائی تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس اتفاقی حادثے نے دونوں خاندانوں کو عارضی طور پر یکجا کر دیا تھا۔

"باجی! آپ کا سر دباؤں۔"

ندرت اس کا ہاتھ تھامے بڑے خلوص سے عجیب وغریب پیشکش کر رہی تھی۔

"لو جی۔" ان کی عقل کو غالباً ڈائریا ہو گیا ہے وہ مشکل سے ہوش وحواس کی دنیا میں آئی ہیں۔ یہ ان کا گلا دبا کر دوبارہ انہیں۔"

نبیل نے ندرت کی پیشکش پر اس کی خبر لیتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

"میں نے سر دبانے کو کہا تھا نبیل بھائی۔"

ندرت نے خاصی ناراضگی سے اسے جوابی طور پر گھورا تھا۔

"بھئی تمہاری نظر خاصی کمزور ہے اور دوسرا سر اور گردن کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے ہو سکتا ہے تم اس کی پیمائش میں غلطی کر جاؤ تمہاری

جیومیٹری بھی تو کمزور ہے ناں۔"

نبیل نے نہایت معصومیت سے توجیہہ پیش کی تھی اور زرشہ تکلیف میں ہونے کے باوجود ہنس پڑی تھی۔

وہ اس وقت پہاڑی کے اوپر بنے پارک میں بینچ پر دراز تھی۔ دادی بی نے بڑی چاہت سے اسے سہارا دے کر بیٹھاتے ہوئے سیون اپ میں دودھ ملا کر پلایا تھا۔ اور تو اور رفعت نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے اسپیشل سینڈوچز اسے پیش کیے تھے۔

"شکریہ۔"

واپسی پر ایک لمحے کے لیے اس کی ارسل سے علیحدگی میں بات ہوئی تو دھیمے سے متشکرانہ لہجے میں کہا۔

"کس بات کا۔"

ایک خوبصورت سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی تھی۔

"مجھے بچانے کا۔"

اس کی مسکراہٹ اور لہجے کی شوخ سی حرارت نے زرشہ کو گڑبڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں نے تمہیں بچا کر اپنی زندگی بچائی ہے۔"

ادھر ادھر دیکھ کر بڑے دھیمے سے اس کے قریب جھکتے ہوئے اس

نے سحر انگیز لہجے میں کہا تھا۔

زرشہ نے پزل ہو کر مضطربانہ پلکیں جھپکاتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔ وہ کچھ ایسے انہماک سے اس کا چہرہ تک رہا تھا کہ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ ہاتھوں کو نروس سے انداز میں مسلتے ہوئے اس نے فوراً پلکیں اور گردن جھکائی تھی اور پھر کچھ کے الجھے انداز میں شاہین خالہ کے پیچھے ہو لی تھی۔

دیکھا تمہیں تو دل یہ بے قرار ہو گیا

او جانِ جان ہم کو تم سے پیار ہو گیا

بڑے سرشار سے مگن سے انداز میں وہ سیٹی پر دھن بجا رہا تھا۔

''خیریت تو ہے بھائی میاں۔ گانا تو یہ میری کلیکشن میں سے ہے۔ اور زبان پر آج کل آپ کے بڑا سننے میں آ رہا ہے۔''

نبیل کو اچھی خاصی فکر ہو چکی تھی۔

جواب میں وہ ہنس پڑا۔

''بس یار ایسے ہی دل آ گیا ہے اس گانے پر دراصل۔''

''ہائیں۔ یہ حادثہ کب اور کیسے اور کیونکر رونما ہوا۔''

نبیل کو اس انہونی پر خاصا اچھنبا ہوا تھا

کسی کو کیا کہ خود دل کو خبر ہونے نہیں پاتی
بدل جاتی ہے نظر انتخاب آہستہ آہستہ

سامنے ٹیرس پر جھکی لان کی سمت متوجہ سبز اور سرخ پرنٹ کے کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑے فریش فریش سی زرشہ پر نگاہ خاص ڈالتے ہوئے اس نے بڑی رومانیت سے شعر پڑھا تھا۔

نبیل۔ سچ مچ بحر حیرت میں ہچکولے کھانے لگا۔

''آ۔آپ کو شعر بھی یاد آنے لگے۔یعنی کہ۔''

اسے سچ مچ خاصا صدمہ ہو رہا تھا۔

''معاملہ گڑبڑ ہے اس کا مطلب ہے۔ ہے ناں۔''

اس نے اون سلائیوں سے الجھی نگین کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھا تھا۔

وہ سادگی سے مسکرا کر بغیر کوئی کمنٹ دیے اپنے کام میں مشغول ہوگئی تھی۔ زرشہ کی نظریں بھی اپنے لان سے ہٹ کر ان کے لان کی سمت آ چکی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان کے سامنے موجود تھی سرخ و سبز رنگین لبادے

میں اس کے حسن بے مثال کی جگمگاہٹ اور نرماہٹ مزید اجاگر ہو کر اسے شعلہ جوالہ بنا رہی تھی۔

''آیئے۔آپ بھی آیئے۔ یہاں بڑا اہم مسئلہ ڈسکس ہو رہا ہے جس میں ایک ذہین وفطین دماغ کی کمی ہم محسوس کر رہے تھے۔''

نبیل نے اپنے مخصوص انداز میں اسے خوش آمدید کہا تھا۔

''ایسا کون سا مسئلہ درپیش ہو گیا۔''

وہ نرم نرم سبز گھاس پر بے تکلفی سے چوکڑی مار کر بیٹھ گئی تھی۔

''یہ اپنے بھائی ارسل ایاز کے دل کے نٹ بولٹ کچھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ جس سے فائدہ اٹھا کر کوئی دل کی چوکھٹ عبور کر کے اندر آ گھسا ہے۔''

نبیل نے نہایت سنجیدگی سے مطلع کیا تھا۔

زرشہ نے بے ساختہ چونک کر ارسل کی سمت دیکھا تھا مگر اس کی پہلے سے اپنی جانب نگران آنکھوں سے تصادم ہونے پر یکلخت نگاہ کے ساتھ ساتھ رخ بھی قدرے موڑ لیا تھا تاہم چہرے پر آنے والے رنگ کوشش کے باوجود چھپا نہیں سکی تھی۔

''یہ تو بڑے بہادر ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ہمت کر کے اس جبراً اندر

داخل ہونے والے کو باہر نکال پھینکیں۔''

اس نے دزدیدہ نظروں سے ارسل کو دیکھتے ہوئے رکے رکے سے لہجے میں کہا۔

''کچھ معاملات میں ساری بہادری اور جوانمردی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔''

ارسل کا ذومعنی انداز اس کے گالوں کو گلابی کر گیا۔

تعلق بڑی آہستگی سے بڑے غیر محسوس، طریقے سے پروان چڑھتا ہے۔ یکلخت جب احساس ہوتا ہے تو دل کی دھڑکنیں انوکھے طریقے سے راگ الاپتے ہوئے بے ترتیب ہونے لگتی ہیں۔ پھر رفاقتوں سے بھرپور لمحے اس آگہی کو مزید پختہ کر کے یقین و ایمان کی منزل تک لے آتے ہیں پھر پلٹنے کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا تعلق کی وہ ننھی اینٹ دیوار چین سے بڑھ کر مضبوط ہو جاتی ہے۔

انہیں خبر بھی نہیں ہوئی غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کی زندگیوں کا حصہ بنتے گئے دوئی کا ہر احساس جیسے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا۔

وہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچی تھی اس دن نبیل

نے بتایا تھا ارسل بھائی اوپر ٹیرس پر ہیں۔

ٹیرس کا بھاری آبنوسی دروازہ اس نے بڑے بے آواز انداز میں کھولا تھا پھر بعجلت دوسرا جالی والا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ جیسے غیر مرئی طاقت نے اسے انہی قدموں پہ جمار ہنے پر مجبور کر دیا۔ ایک پراسرار سا احساس برقی رو کی طرح اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگا تھا۔ شاید یہ اسرار نگین کے سوالیہ لہجے میں تھا جو اس کے اندر یکلخت سرایت کر گیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

''ارسل! یہ کیا چکر ہے تمہارا زرشہ کے ساتھ۔؟''

جواب میں وہ ہنس پڑا۔ پھر نشست تبدیل کرتے ہوئے دونوں ہاتھ سر اور گردن کی پشت پر باندھ کر آرام کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ لاپروا انداز میں بولا۔

''کیا مطلب۔ کون سا۔ چکر بھئی۔''

''کیا سیریس ہو تم اس کے ساتھ۔؟''

نگین نے دوٹوک پوچھا۔

''کسی معاملے میں۔؟''

ارسل نے سر پر آئے بال بے نیازی سے پیچھے کیے تھے۔

''اب بنو نہیں اچھا۔''

نگین نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

''ویسے ارسل یہ سب اچھا نہیں ہو رہا۔''

وہ یکلخت سیریس ہو گئی تھی۔

''تم جانتے ہو۔ دونوں فیملیز کے درمیان تعلقات کتنے کشیدہ اور ناخوشگوار ہیں۔''

''اول تو زرشہ کی نانی ہی نہیں مانیں گی اور جو بالفرض وہ مان بھی جائیں تو بھی دادی بی سے یہ درخواست کرنے کی جرأت کس میں ہو گی۔ وہ تو قیامت تک ایسا قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیں گی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے منہ سے یہ بات سن کر صدمے سے وہ خدانخواستہ ہوش ہی کھو بیٹھیں عائشہ ہاؤس والوں نے ہمارے ساتھ کچھ کم تو نہیں کیا۔''

وہ خیال انگیز نظروں سے ارسل کو دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

جواب میں ارسل کا طویل جاندار قہقہہ فضا میں بکھرتا گیا۔

''ارے پاگل۔ تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں زرشہ کے لیے سنجیدہ ہوں۔ میں بھلا اس لڑکی کو اپنا سکتا ہوں جس کی ماں اور نانی نے میرے باپ کی' میری ماں کی' اور دادی بی کی عزت نفس مجروح کی۔ جس کے باپ نے میرے باپ کی خودی۔ انا اور مردانگی پر کاری ضرب لگائی۔ جس کی نانی نے ظلم اور سفاکیت کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے میرے باپ کی مضبوط شخصیت

پرزے پرزے کر کے بکھیر دی۔ میں اس فیملی سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو یہ
اپنی شریک حیات کا مرتبہ دے سکتا ہوں۔ میں ایسا کر سکتا ہوں بھلا۔''

اپنے لہریہ دار گھنے بالوں میں مضطربانہ انگلیاں چلاتے ہوئے وہ
بے تحاشا قہقہے لگا تا کہہ رہا تھا۔

زرشہ کے دل کو جیسے کسی نے فولادی پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

''پھر یہ سب کیا ہے۔؟''

نگین حیرت سے دریافت کر رہی تھی۔

''ایک ڈرامہ۔ محض ڈرامہ۔''

اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

''اسے بے وقوف بنانے کا اپنے دام میں گرفتار کرنے کا۔ عائشہ بیگم
نے بڑے اہتمام اور انتظام سے میرے باپ کے ارمانوں کا خون کیا تھا۔ ایک
تماشہ انہوں نے میرے باپ کو دکھایا تھا اور اب ایک تماشہ میں انہیں دکھاؤں گا
جب وہ اپنی لخت جگر کو بے قرار و بے کل تڑپتا سلگتا دیکھیں گی تو احساس ہوگا کہ
ٹوٹے دل کی کرچیاں چننا کیسا اذیت ناک مرحلہ ہوا کرتا ہے۔''

ارسل کی بھوری، شفاف آنکھوں میں وحشت اور اضطراب کی لہریں
کروٹ لے رہی تھیں۔ چہرے پر ایک نامعلوم سے آزردہ احساس کی تپش
نمایاں تھی۔

نگین دم بخود اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''ارسل۔ امیں نہیں جانتی تھی تم اتنے اذیت پسند اور منصوبہ ساز بھی
ہو سکتے ہو۔؟ تمہاری شخصیت کا یہ پہلو پہلی بار میرے سامنے آیا ہے میں تو
تمہیں ایک لاابالی سا' بے فکر سا' شوخ نوجوان ہی سمجھتی تھی۔''

''نگین! وہ لوگ کبھی قابل معافی نہیں ہوتے جو دوسروں کی عزت
نفس پہ پاؤں رکھ کر اپنے غرور کے محل تعمیر کرتے ہیں۔ جو کسی کے سچے
جذبات اور قدردان لہجوں پہ ایمان لانے کے بجائے ظاہری مرمریں سراپے
اور چاند چہرے کی چمک دمک سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

وہ وقت، وہ لمحے بابا جان پر اور دادی بی پر کیسے قیامت خیز اور دردناک
ہوں گے میں ان کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ انتقام کی یہ آگ تو بڑے عرصے سے
میرے سینے میں دہک رہی تھی۔ بس موزوں وقت کی تلاش میں تھا۔''

ارسل کے غم و غصے سے چٹختے تڑختے زہریلے لہجے کا ڈنک زرشہ کی
نس نس میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں اس بری طرح کانپ رہی تھیں۔
گویا دم آخر۔ آن پہنچا ہو۔ اس میں مزید سننے کی تاب رہی تھی اور نہ خواہش۔
حلق آنکھیں ہونٹ ہر شے سوکھتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ کچھ
لمحے یونہی پیاسی کھڑی رہی تو ہوش حواس کی دنیا ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

دروازے کے پٹ ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر کے وہ مرتعش
قدموں سے تیز تیز سیڑھیاں طے کرتی ہی چلی گئی۔

"ادھر کون ہے بھئی۔؟"

پٹ چھوڑ دیے جانے پر تنے اٹھے تھے ان کی آواز کان میں پڑتے ہی نگین نے پلٹ کر دیکھا تھا مگر کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکی تھی۔

اک طوفان تھا اک قیامت تھی۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ تھے جو اس کے وجود کو اپنے ساتھ بہائے لیے چلے جا رہے ہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ غیر مرئی قوت نے اس کے اعصاب کو منجمد کر کے رکھ دیا ہو۔ اس قدر بھیانک خواب تو اس نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ لمحے تو کبھی بھی اس کی ہنستی مسکراتی پرسکون مطمئن زندگی میں نہیں آئے تھے۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیسا سیلاب آیا تھا جذبات میں۔

وہ وارفتہ مہکتے گلاب جذبے محبتوں کے جام لنڈھاتی بولتی شرارتی آنکھوں کا انہماک لہجے کی ملائم ریشمی چھیڑ چھاڑ۔

لمس میں چھپی شدت جذبات سے گندھی جنونی سی تپش۔

اس کے اعصاب برف ہو رہے تھے۔

اگر یہ انتقام تھا تو نہایت اچھا انتقام تھا۔

واقعی یہی ہونا چاہیے تھا۔ نانی بی اور مما پاپا کی خود غرضی اور سرد مہری کا اس سے اچھا جواب اور ممکن بھی نہیں تھا۔ ان کی لاڈلی بیٹی کو اذیت کے آبلہ پا۔ گھنے جنگلوں میں دھکیل کر ساری عمر ہوتے رہنے کے لیے اکیلا!

چھوڑ جانا ایک نہایت ہی واضح اور متوازن جواب ہے۔

لیکن۔؟

کیا میں ایسے موڑ پر عائشہ ہاؤس والوں کو تنہا چھوڑ دوں۔؟ انہیں ملال اور پچھتاووں کی آگ میں جھونک دوں۔؟

کیا نانی بی کے چمکتے گلابی صحت مند چہرے کو خزاں رسیدہ بنا دوں، وہ جو میرے ہونے کے زعم میں اتنے فخر اور انبساط سے سر اٹھائے مغرور مغرور پھرا کرتی ہیں ان کا سر ہمیشہ کے لیے نیچا کر دوں۔

ان کی بے پناہ محبتوں کا یہ جواب دوں اس کے اندر شدید اعصابی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔

"نانی بی کی شکست اور ہتک کیا مجھ سے برداشت ہو پائے گی۔؟"

وہ اپنے اندر سے سوال کر رہی تھی۔

"نہیں۔ میں تو ٹوٹی بکھری ہی ہوں۔ اس بوڑھے نحیف وجود کو کیوں اس عمر میں دکھوں سے نڈھال کروں۔"

اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ایک بہت سنجیدہ اور بڑا فیصلہ۔

''ہیلو۔''

اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کہتے ہوئے وہ دھپ سے اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

ارسل نے فائلوں کے بیچ سے قلم تلاش کرنے کا ارادہ ترک کر کے سر اٹھایا۔ اسے دیکھ کر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ اس کی آنکھوں اور لبوں پر در آئی۔

''ہاں۔۔۔بھئی کہاں گم تھیں اتنے دنوں سے۔''

''بس۔اپنی ذات کے سمندر میں گم تھی۔''

''ہائیں۔''

اس کے اس قدر سنجیدہ اور غیر متوقع جواب پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ
گیا۔ وہ ایک دم ہنس پڑی۔ ٹوٹے کانچ کی سی مضطرب کھوکھلی ہنسی۔

''ایسے ہی فلسفہ جھاڑ رہی تھی۔ ویسے اب سنجیدگی سے گم بلکہ غائب
ہونے کا ارادہ ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''فلائی کرنا ہے بھئی۔ قاہرہ۔ واپس۔''

اس نے سرسری سے انداز میں بتایا تھا۔

ارسل کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ فائلیں ایک طرف رکھ کے وہ
پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم۔''

اس کے چہرے پر پریشانی کے واضح آثار تھے۔

''تمہارا یہ یکا یک پروگرام کیسے بن گیا قاہرہ لوٹنے کا۔''

''اچانک تو نہیں بنا بھئی۔''

وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ سے اس کی فائل کے کور
سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

''منیب۔ کا فون آیا تھا۔''

''منیب کون۔؟''

اس نے استفہامی انداز میں بھنویں اچکائیں۔

''سبین خالہ کے بیٹے ہیں سب سے بڑے۔ پائلٹ ہوتے ہیں۔
بھئی کیا شاندار چیز ہیں وہ۔'' اس کے لہجے میں رشک، اپنائیت اور یگانگت
کی جھلک تھی۔

ارسل نہایت خاموش نگاہوں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ گویا
منتظر تھا کہ پوری بات سن کر ہی کوئی تبصرہ کرے۔

''کہہ رہے تھے بھئی شرارت کی پڑیا۔ اب زیادہ عرصہ تمہارے بغیر
نہیں رہا جا سکتا۔''

وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھتی ہوئی قریبی کیاری کے پھولوں سے اٹھکیلیاں
کرتے ہوئے بڑے فریش سے کھلکھلاتے ہوئے انداز میں بتا رہی تھی۔

ارسل ہنوز چپ چاپ اس کی حرکات و سکنات اور لہجے پر غور کر رہا تھا۔

''میں نے کہا۔ تین ماہ ہی تو ہوئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے۔
جب وہاں تھی تو جی بھر کر لڑتے تھے مجھ سے کہتے تھے جب تم پاکستان واپس
جاؤ گی تو میں سکھ کا سانس لوں گا اور اب تین ماہ نہیں رہ سکے۔ دراصل پیار بھی
تو بہت کرتے ہیں مجھ سے۔''

اس کا لہجہ احساس محبت سے پور پور چور تھا۔ ارسل اسی جامد نگاہوں
سے اسے دیکھ رہا تھا

"سبین خالہ بھی بہت عرصے سے کہہ رہی ہیں واپس آنے کو۔ کہہ رہی تھیں اب پاپا کا تمہیں لے آئیں گے۔ ایسی زنجیر سے باندھ دیں گے کہ واپس پاکستان جانے کا خیال ہی نہیں آئے گا۔"

وہ شگفتگی سے ہنس پڑی تھی۔

"میں نے کہا خالہ! مجھے واپس آپ کے پاس ہی آنا ہے۔ میرا کون سا دل لگ جائے گا۔ آپ لوگوں کے بغیر۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں انہیں بہت مس کرنے لگی ہوں۔"

واپس کب آؤ گی۔؟"

ارسل کا لہجہ ایسا تھا گویا اس سوال کے پس پردہ اس کے عزائم کی کھوج لگانے کا ارادہ ہو۔

"واپسی۔"

وہ اوپر آسمان پر اڑتے پرندوں کے غول کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنے اپنے آشیانوں کو پلٹ رہے تھے۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"واپسی تو اب شاید ہی ہو۔ یوں بھی کس کے لیے ایک نانی اور خالہ شاہین ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی اتنے عرصہ تک دور رہی ہوں کیا فرق پڑے گا۔"

"نانی اور شاہین خالہ کے علاوہ اور کوئی ہے یہاں تمہارا۔؟"

وہ ایک ایک قدم اٹھاتا عین اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور اس کی کھلی آنکھوں میں سیدھا جھانکتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔ لہجے میں گمبھیرتا سی تھی۔

یہیں سے زرشہ کا امتحان شروع ہونا تھا۔ اسے اس لہجے، اس نگاہ اور اس قربت کے حصار سے خود کو مکمل طور پر بچائے رکھنا تھا۔ یہیں سے دل کے اندر اٹھتے شور مچاتے جذبات کے دریا پر بند باندھنے کا مرحلہ شروع ہوتا تھا۔

"نہیں بھئی میں نے یہ کب کہا۔ تم سب لوگ بھی میرے اپنے ہو۔ مگر ارسل ظاہری بات ہے۔ ہیں تو ہم سب ایک دوسرے کے مخالف کنارے ہی ناں۔"

"مگر اب تو یہ فاصلے سمٹ چلے ہیں۔"

"کہاں۔؟"

وہ تردیدی طور پر ہنسی۔

"یہ تو نظر کا دھوکہ ہے۔ رسم دنیا ہے۔ بھلا دادی بی اور نانی جان کے دلوں پر تمام سالوں پر محیط میل دھل سکتا ہے؟ ہم اس ضمن میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں؟۔ نہیں ناممکن۔"

اس نے سر کو ادھر ادھر جنبش دے کر قطعیت سے کہا۔

"تو پھر اب تک جو کچھ ہمارے درمیان تھا۔ وہ کیا تھا۔؟"

وہ الجھ سا گیا تھا۔

"وہ بھی نظر کا دھوکہ تھا۔"

اس کے لہجے میں آزردگیاں سمٹنے لگی تھیں۔

"بھئی۔ کچھ لمحات خوشگوار اور حسین گزارنے کے لیے دلوں سے وقتی طور پر بدگمانیاں بھلا دینا کونسا مشکل کام ہے۔ ورنہ ارسل۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ حد فاصل تو شروع سے ہمارے مابین موجود ہے۔ تم اپنے ابو کی شکست کا دکھ بھول سکتے ہو؟ میں اپنی جان سے عزیز نانی کو دغا دینے اور اکیلا چھوڑ دینے کا تصور کر سکتی ہوں؟ نہیں ہم دونوں ایسا نہیں کر سکتے۔"

وہ پھولوں کی پتیوں کو مسلسل دھیرے دھیرے مسل رہی تھی۔

ارسل کی پیشانی پر تفکر کی بے شمار لکیروں کا جال سا بچھ گیا تھا۔

"تو پھر اس راستے پر لائی کیوں تھیں مجھے، جب کسی کی چاہت کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں تو پھر مجھے کیوں پھنسایا۔"

وہ تند نگاہوں سے اسے گھورتا ہوا اس کے بہت نزدیک آ گیا اور اپنی فولادی انگلیوں سے اس کے شانے سختی سے جکڑ لیے تھے۔ اس نے پیشانی پر آئے بال ایک ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے براہ راست ارسل کی شعلہ بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بڑے استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"ارسل! کیوں بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ کس نے کس کو پھنسایا کس نے کس کے جذبات سے کھیلا۔ کس نے کس کو بے وقوف بنایا۔ کس کا کتنا قصور ہے۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو اور میں بھی جان گئی ہوں۔ چھوڑو پرانی یادیں پرانے قصے۔ رات گئی بات گئی۔ ڈراما تم نے اچھا کیا اور کردار میں نے بھی خوب نبھایا۔"

اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے پرے ہٹاتے ہوئے وہ دوبارہ لاپروائی سے پھولوں کی باڑھ کی سمت بڑھ گئی تھی۔ چند ساعت کو وہ جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر بے شمار قطرے پھوٹ نکلے۔ رنگ فق سا ہو گیا۔ تو گویا اس کا پول کھل چکا تھا۔ اس دن نگین کو واہمہ نہیں ہوا تھا۔ کہ کوئی ادھر کھڑا تھا۔ وہ زرشہ تھی۔

"زری۔ آئی ایم سوری۔ دراصل وہ سب تو مذاق۔"

"مذاق وہ نہیں تھا۔ مذاق تو وہ تھا جو ہم نے محبت کی آڑ میں کیا۔ اور تمہیں معذرت خواہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سب کچھ سچ تھا جو تم نے کہا اور میں نے سنا۔ اچھا ہوا ایک دوسرے کے دلوں کے میل اور بدگمانیاں کھل کر سامنے آ گئیں۔ خبر ہو گئی کہ ہم دونوں بہت خوبصورتی سے ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے تھے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

وہ جونہی پشیمان سا ہو کر اس کی سمت مڑا تھا اس سے پہلے ہی زرشہ

نے پلٹ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے آرام سے وضاحت کر دی۔

ارسل کے دل پر جیسے برف کی سل سی دھر دی گئی۔

''زری۔''

اس کے لہجے میں عجب بے کلی اور بے چینی سی سمٹ آئی تھی۔

''دراصل زری یہ بات نہیں ہے۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنے اندر کے جذبات کس طرح اس پر عیاں کرے کیونکہ یہ کل جذبے تو خود بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے جو اس کے جانے اور منیب سے قربت کا سن کر اچانک اس کے اندر پھوٹ نکلے تھے۔

''نگین سے جو کچھ میں نے کہا وہ اپنی جگہ لیکن زری۔''

وہ عجیب الجھے ہوئے انداز میں چکر کاٹ کر اس کے مقابل آیا تھا۔ اضطراب کے عالم میں اپنی انگلیاں چٹخاتا وہ عجیب الجھن اور کشمکش سے دوچار تھا۔''

تمہارا میرا تعلق۔''

''چھوڑو بھی ارسل۔''

اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔''

''کیوں خوامخواہ پچھی ہو رہے ہو۔ ایسے صفائیاں دیتے بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔ کیا ہوا جو تم نے نگین سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ بھئی بند

ے کو اپنا حساب کتاب صاف رکھنا چاہیے۔ یوں بھی ارسل یہ تو سامنے کی بات ہے سب کو یقیناً اندازہ ہوگا کہ ہمارے درمیان سوائے منافقت اور چکر بازی کے اور کوئی تعلق استوار نہیں ہو سکتا۔ بھئی ندی کے دو کنارے کیسے مل سکتے ہیں آپس میں۔ نانی اور دادی بی دونوں ہمارے جذبات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ تبھی تو دیکھ لو دونوں اطراف سے کوئی روک ٹوک سامنے نہیں آئی۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے دلوں کا غبار کبھی نہیں دھل سکتا چاہے لاکھ ظاہری اپنائیت جتائی جائے۔ اب تم بھی زیادہ سیریس نہیں لو۔ پرسوں منیب۔۔۔ آ رہے ہیں۔ تمہیں ملواؤں گی ان سے۔ ان کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک مزیدار واقعات ہوتے ہیں سنانے کو۔ مخاطب کو بالکل گم کر کے رکھ دیتے ہیں اپنے قصے کہانیوں میں۔ ایک ہفتہ رہیں گے وہ یہاں۔ پھر ہم دونوں فلائی کر جائیں گے۔''

ارسل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر مضطربانہ اس کی سمت دیکھا تھا۔

''زری؟ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ یقین کرو۔ وہ سب کچھ جو میں نے کہا۔''

''ارسل۔!''

اس کی بات کاٹ کر وہ بڑی رسانیت سے بولی۔ تم کیوں خوامخواہ کونشس ہو رہے ہو۔ بھئی میں نے برا نہیں منایا اس بات کا۔ ظاہری بات

ہے تم نگین سے یہ بات نہ کرتے تو مجھے یہی بات کسی دوسرے سے کرتے سن لیتے۔ کیونکہ حقیقت تو حقیقت ہے اور اب مجھے اجازت دو۔ نانی بی سچ مچ تو پ لیے دروازے پر کھڑی ہوں گی، انہوں نے مجھے ساتھ والی آنٹی سے کڑھی میں ڈالنے کے لیے تھوڑا سا انار دانہ مانگنے کے لیے بھیجا تھا اور میں تمہیں لان میں بیٹھا دیکھ کر ادھر آ گئی۔ چلتی ہوں۔"

وہ لپک جھپک روانی سے بولتی گیٹ پار کر گئی۔ وہ یونہی منجمد کھڑا بے تاثر آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

"یار! اب چلنے کی تیاریاں پکڑو۔ دو دن رہ گئے ہیں فلائٹ میں۔ امی جان شدت سے تمہاری منتظر ہوں گی۔ اور سن لو اب دوبارہ آنے کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھ سے نہیں رہا جاتا تمہارے بغیر ویسے امی جان کا ارادہ ہے کہ اب کی بار تمہارا ایسا انتظام کریں گی کہ دوبارہ لوٹنا ممکن ہی نہیں رہے گا۔"

منیب بال ہاتھ میں اچھالتے ہوئے ایزی چیئر پر بیٹھ گئے اور۔۔۔ بڑے فریش سے اپنائیت بھرے انداز میں اس سے مخاطب ہوئے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور انگوٹھا دکھاتے ہوئے بولی۔

"اپنے ارادے اپنے پاس ہی رکھیے۔ میں جانتی ہوں، یہ پٹی یقیناً آپ نے ہی پڑھائی ہوگی خالہ جان کو۔"

"ایسا ہی سہی۔ لیکن بھئی سیر سلی اب تم ذرا ہل جل لیا کرو۔ جانتی ہو، جا کر میرے کتنے کام نپٹانے ہیں تمہیں؟ سب سے بڑھ کر تو میرا وہ کام ہے جو میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔"

وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"جانتی ہوں۔ بھئی جانتی ہوں۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر تسلی کرائی۔

"ویسے شادی کوئی اتنا ضروری معاملہ تو نہیں ہے۔"

آگے کو جھک کر چھیڑنے کے سے انداز میں بات کرتی ہوئی وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھی۔

"ایسا ہی ہے تو میرے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔"

جواب میں منیب نے بڑے غصے سے اسے گھورتے ہوئے اس کی آگے کو جھولتی سرمئی ریشمی لٹیں کھینچ ڈالیں۔

"بے وقوف! تمہارے بغیر شادی کا میں سوچ سکتا ہوں؟ جب مرکزی کردار ہی نہیں ہوگا تو شادی کیا جادو سے ہو جائے گی جو منتر پڑھتے ہی۔"

"اچھا۔ اچھا بھئی مان لیا کہ ہم ہی آپ کی زندگی کی ڈوبتی نیا کو پار لگائیں گے۔ اب میرے ہیر اسٹائل کی جان بخشی تو کر دیں۔"

اس نے فوراً صلح جو انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے معصوم سی صورت بنائی تھی۔

منیب اس کی شکل دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑے۔ اور پھر پیار بھرے انداز میں سر پر زور سے چپت لگاتے ہوئے بال چھوڑ دیے اور ایزی چیر کی پشت سے ٹک گئے۔

اور سامنے ٹیرس پر بیٹھے اتنی دیر سے ان کی طرف پورے حواسوں سے متوجہ ارسل کا دل جل جل کر کوئلہ کباب ہو گیا۔

وہ دونوں ٹیرس پر بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ دونوں گھروں کے ٹیرس باؤنڈری وال سے کافی آگے کو اس طرح بڑھے ہوئے تھے کہ دونوں کے بیچ کا فاصلہ بہت کم رہ جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں اطراف کے سین اور گفت وشنید بخوبی دونوں اطراف سے ملاحظہ کی جاسکتی تھی۔

کتنی ہی دیر سے وہ کڑھتے دل سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔

''ہونہہ افرادی۔ یہی سین پاٹ کبھی میرے ساتھ بھی کرتی تھی۔''

اس کی نگاہوں سے چنگاریاں سی برسنے لگی تھیں۔ دل میں قیامت کا حشر تھا۔

''بے وفا۔ دھوکے باز۔''

وہ غم و غصے سے نڈھال ہو رہا تھا۔

''میں نے بھی تو اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔''

کوئی اندر سے جیسے بولا۔

''لیکن نہیں۔ دھوکا تو نہیں تھا۔ میں نے ایسا کہا ضرور تھا مگر۔''

''بھئی اس نے تو جو سنا اس پر اعتبار کرے گی ناں۔''

اس کے اندر سوال جواب کا سلسلہ کھلا ہوا تھا۔ پھر اس کی روانگی کا جان لیوا مرحلہ آن پہنچا۔ اس دن وہ نانی جان کی شعلہ بار نظروں کے خوف اور دادی بی کی ناراضگی کو پس پشت ڈال کر۔ بے دھڑک عائشہ ہاؤس جا پہنچا۔ بیل بجانے کی زحمت کیے بغیر کھلے دروازے سے وہ اندر داخل ہو گیا۔

''زرشہ بی بی کہاں ہوں گی۔؟''

سامنے سے آتی اپنے دھیان میں مگن کلثوم اس کے استفسار اور موجودگی دونوں پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''اوپر اپنے کمرے میں مگر تسی۔''

وہ الجھن میں پڑ گئی۔ پہلے تو کبھی اندر تک رسائی نہیں ملی تھی اسے۔

وہ اسے جوں کا توں حیرت سے بت بنا چھوڑ کر برق کی سی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اس کے بیڈروم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ ابھی ابھی باتھ لے کر نکلی تھی۔ گیلے بالوں کو تولیے سے جھٹکتے ہاتھ اسے دیکھ کر میکانکی انداز میں ساکت ہو گئے تھے۔ وہ بے یقین نظروں سے

اسے دیکھ رہی تھی۔ روانگی میں محض دو تین گھنٹے ہی تو رہ گئے تھے۔ سامان سارا بندھا پڑا تھا۔ ہر شے تیار تھی۔

"تم۔"

اس کے بند لب بالآخر کھل گئے۔

"زری۔!"

وہ بجلی کی سی سرعت سے اس کی سمت بڑھا۔ اس کے چہرے پر اتنی دیوانگی اور خودفراموشی تحریر تھی کہ زرشہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"زری! میرا یقین کرو۔ وہ سب کچھ جو میں نے کہا۔"

اس نے اس کے دونوں کندھے تھام لیے اور عجب بے قراری کے عالم میں اسے یقین دلانے کو جھنجھوڑنے لگا۔

"ارسل۔!"

لبوں کے ساتھ ساتھ اس کا پورا وجود مرتعش ہو گیا تھا۔

"آئی لو یو زری۔ آئی لو یو ویری مچ۔ بلیوی پلیز۔"

اس کے شانوں پر دباؤ ڈالتا وہ عجب ازخود رفتگی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی شدت آمیز جنونی سی التجائیں رقص کر رہی تھیں کہ زرشہ کا رواں رواں لرزیدہ ہو گیا۔ اتنے عرصے سے سنبھالا ہوا ضبط کا دریا ابلنے کو بے تابی سے ہمکنے لگا۔

"تم نہ جاؤ۔ زری پلیز۔"

اس کا جاندار بھرپور حدت آمیز لمس، نگاہوں کی دیوانگی، جذبوں کی انتہاؤں سے گندھا لہجہ اس کی وارفتہ سی قربت ہر شے اسے پگھلا کر پانی بنا رہی تھی۔ صبر و تحمل، مصلحت اور ان کا پیمانہ چھلکنے کو ہی تھا کہ اس نے اپنی ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے نئے سرے سے خود کو سنبھال لیا۔

"ارسل! تم بالکل بچوں کی طرح بی ہیو کر رہے ہو۔"

یہ ہنسی جو لبوں پر بمشکل تمام لائی گئی تھی وہی جانتی تھی کس قدر عظیم ضبط کا مظاہرہ کر کے آئی تھی۔

"میں نے کہا ناں جو ہوا سو ہوا۔ مذاق تھا یا حقیقت بہر حال گزرے وقت کے ساتھ یہ قصہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ تم اتنا سیریس کیوں لے رہے ہو۔!"

وہ نرمی سے اس کے ہاتھ پرے ہٹا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بال بنانے لگی۔

کچھ ثانیے کے بعد اپنے پیچھے اسے ارسل کا عکس ابھرتا ہوا دکھائی دیا۔ مضمحل، ملول، دلگرفتہ اور بکھرا ٹوٹا سراپا لیے وہ ویران نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

زرشہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ایک لمحے کو دل کی دھڑکنیں یوں بے قرار ہوئیں کہ ان کے شور سے اس کا پورا وجود لرزنے لگا۔

"کیا تم منیب کے ساتھ خوش رہ سکو گی۔؟"

زرشہ نے دھیرے دھیرے مڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ اس کے لہجے اور چہرے پر مبہم سا استفسار تھا۔

"میں پہلے بھی سبین خالہ کی فیملی کے ساتھ خوش ہی رہی ہوں اتنا عرصہ۔"

نظریں چرا کر وہ دھیمے سے کہہ کر پھر آئینے کی سمت مڑ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے زری! میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔"

تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے بالآخر اس نے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر میرے اصرار، التجاؤں کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے میں کسی نہ کسی طرح خود کو سمجھا لوں گا۔ بس تم سے میری اتنی درخواست ہے کہ میرے دل کی تسلی کے لیے خدارا مجھے اتنا یقین دلا دو کہ تمہیں میرے جذبات کی صداقت پر اعتبار ہے۔ پلیز زری۔"

وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔

اسے اعتبار دلا دیتی تو پھر خود اپنے دل کو سمجھانے کے لیے کس نظریے کی آڑ لیتی؟ ابھی تو یہ دل بہلاوا ہمراہ تھا کہ دونوں طرف سے فریب کا وار استعمال کیا گیا تھا سو حساب برابر ہوا۔ اسی لمحے منیب اندر داخل ہوئے۔

"ارے بھئی باقی ہار سنگھار جہاز میں بیٹھ کر کر لینا۔ خدارا اب نکلنے کی کرو۔ اگر اتنا ہی ہے تو میں جان کی قسم کھا کر یقین دلانے کو تیار ہوں کہ اس طرح بھی کم از کم چڑیل ہرگز نہیں لگ رہی ہو۔"

وہ اس کی سست رفتاری پر رواں تبصرہ کرتے ہوئے اس کے سامان کی طرف بڑھتے تھے۔ پھر اچانک ہی نظر ارسل پر پڑی۔

"ارے آپ! ارسل! کہیے بھئی کیسے مزاج ہیں۔؟"

بڑی خوش دلی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ ملایا تھا اس سے۔

وہ کچھ خجل سا تھا۔

"سوچا آپ لوگوں کو خدا حافظ کہہ لوں جاتے سمے۔"

"اچھا کیا بھئی۔ بہت اچھا کیا۔"

وہ بشاشت سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے مسکرائے تھے۔

"انسان کو دل اور ظرف بڑا رکھنا چاہیے۔ رنجشوں کو نسل در نسل ساتھ لے کر چلنے کی روایت نبھانا کسی طور پر دانشمندی کے زمرے میں نہیں آتا۔"

"اچھا اب آپ لیکچر نہ جھاڑیں۔ سامان اٹھائیں جلدی سے۔"

بالوں کو ربر بینڈ میں قید کر کے دوپٹہ سلیقے سے شانے پر پھیلاتے

ہوئے زرشہ نے ان سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

''ایک تو ان محترمہ کا رعب ہم سے نہیں سنبھالا جاتا بھئی۔''

منیب بڑی بیچارگی سے مدد طلب نظروں سے ارسل کو دیکھنے لگے۔

''تو کس نے کہا ہے۔؟''

زرشہ نے ادائے بے نیازی سے کام لیتے ہوئے ترچھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کہنا کس نے ہے۔ مجبور ہیں اف اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔''

انہوں نے سرد آہ بھرتے ہوئے سامان اٹھالیا۔

''تمہارے دن ہیں بھئی ناز نخرے اٹھوانے کے، اور ہم بیچارے بے بس ہیں۔ اب تشریف لے چلیے ملکہ معظمہ۔''

جواب میں وہ کھلکھلا کر اپنا پرس اٹھاتی ان دونوں کے پیچھے آئی تھی۔

ارسل کے دل پر دونوں کے مکالمات خنجر بھالوں کی طرح لگ رہے تھے۔ اس بظاہر شوخ و شریر چھیڑ چھاڑ میں ایک دوسرے کے لیے کتنا پیار اور محبت پوشیدہ تھی اس کا اندازہ اس سے بڑھ کر کس کو ہوسکتا تھا۔

''رہ لیتی ابھی کچھ اور۔ اتنی جلدی واپسی کا سوچ لیا۔''

دشمنی اپنی جگہ مگر بہرحال ایک تعلق تو تھا دادی سمیت خدیجہ ہاؤس والے سبھی لوگ اس کی روانگی سے پہلے ملنے کے لیے آئے تھے۔ دادی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شکوہ کناں ہوئی تھیں۔

''سدا خوش رہو بچے۔ دوبارہ چکر ضرور لگانا۔''

جمیلہ خاتون نے محبت بھرے انداز میں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

''ہم آپ کو مس کریں گے۔؟''

نگین ندرت، رفعت اور نبیل سبھی نے پچھلی تلخیاں بھلا کر خلوص سے کہا تھا۔ بہرحال اتنا عرصہ اس کے ساتھ گزارا تھا۔

نانی کے تو آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے انہیں اپنی قسمیں دے کر چپ کروایا تھا۔ بالآخر سب سے مل کر وہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو بے اختیار پلٹ کر بت کی طرح جامد ساکت مہر بہ لب کھڑے ارسل پر نگاہ ڈالی۔

وہ بغیر پلکیں جھپکائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کیا تھا ان آنکھوں میں۔

حسرت، ملال، رنجیدگی، شکائتیں، شدت جذبات کا اظہار کرتی

رتجگوں کی لالی سے سجی وہ بھوری آنکھیں جیسے اس کے اندر کہیں گڑ کر رہ گئی تھیں۔

''خدا حافظ۔''

اس کے لب ہلے اور پھر جیسے گاڑی کی روانگی کے ساتھ ہی ارسل کے دل سے خوشی اور سکون وقرار کی ہر رمق رخصت ہوگئی۔

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں، چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہ شب غم! نظر یہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
یہ دل پہ کس کس کے نقش باقی ہیں کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی جن سے تھا جشن شعر و نغمہ
وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہہ دام بجھ گئے ہیں

"کیا ہو رہا ہے ارسل! اتنی ٹھنڈ میں باہر بیٹھے ہو۔؟"

ہاتھ میں گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی کے دو مگ لیے نگین عقبی لان کے قدرے ویران سے گوشے میں سنگی بینچ پر بیٹھے ارسل کے قریب آئی تھی۔

اس نے بغیر کچھ کہے بے تاثر نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا اور پھر کافی کا مگ تھام لیا۔

"کیا بات ہے ارسل! بہت چپ چپ رہنے لگے ہو ان دنوں۔"

نگین بہت غور سے اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی جہاں عجیب سا بولتا سکوت چھا گیا تھا۔

"یونہی۔ کچھ کاروباری معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔"

اس کا گریز پا سا انداز نگین کو چونکا گیا۔ اس کے ہاتھ میں یا ارد گرد کوئی فائل یا کاغذ نہیں پڑا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اوپر کھڑکی سے اسے سر جھکائے بیٹھے گھاس کے تنکے توڑتے مروڑتے دیکھتی رہی تھی۔

"مجھے یوں لگ رہا ہے کہ الجھنیں کہیں اور سے پیدا ہوئی ہیں۔"

نگین اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہی تھی۔

جواب میں وہ استفہامی نگاہوں سے بغیر رخ پھیرے بھنویں اچکا

کر خاموشی سے دیکھنے لگا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ارسل کہ۔!"

چند ثانیے کو وہ رکی پھر گویا ہوئی۔

"وہ جو تم نے زرشہ کے لیے اس دن انتقامی جذبات کا اظہار کیا تھا وہ سب کچھ اوپرے دل سے کیا تھا۔ مجھے بہلانے کو اور در حقیقت تم۔"

اس سے پہلے کہ وہ جان لیوا الفاظ اس کے منہ سے ادا ہوتے ارسل نے اضطراری طور پر ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

اس کے لہجے کا کمزور سا احتجاج نگین پر یکلخت آگہی کے بہت سے دریچے وا کر گیا۔ ایک لمحے کو وہ جیسے سناٹے میں رہ گئی۔

"ارسل۔!"

کتنی ہی ساعتیں گزر جانے کے بعد اس نے دھیمے سے اسے پکارا۔"
یہ سب کچھ اچھا نہیں ہوا۔" اس کے لہجے میں ملال تھا۔

ارسل ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی سمت دیکھنے لگا۔

"اگر ایسی بات تھی تو شروع سے کلیئر کیوں نہیں کی دادی بی کے سامنے؟ اب تو بہت سے لمحے وقت کے تھال سے سکوں کی مانند گر کر ماضی کی خاک میں مل چکے ہیں۔"

"تعلقات بنتے بگڑتے وقت کب بتاتے ہیں؟ ہونی نے ہونا ہی ہوتا ہے۔"

ارسل دھیمے سے رنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اس داستان کو ایسے موڑ پر آکر ہی ختم ہونا تھا۔"

"لیکن ارسل تمہیں اس بات کا خود کو یقین دلانا ہوگا۔ دیکھو تو حالت کیا بنا رکھی ہے۔ تم نے زندگی کی ہر خوشی ہر تفریح خود پر حرام کر رکھی ہے۔ جمیلہ پھپھو اور ایاز پھوپھا کس قدر پریشان رہنے لگے ہیں تمہاری اس گم صم کیفیت کی وجہ سے۔ اور دادی تمہاری اس چپ کا دروازہ کھولنے کے لیے زور شور سے آجکل تمہاری شادی کا سوچ رہی ہیں۔"

نگین نے فکرمندی اور تشویش کے ملے جلے انداز میں اسے بتایا۔

اس کی پیشانی پر ناگواری اور تفکر کا جال سا بچھ گیا۔

"نگین پلیز، تم میری اتنی تو مدد کر سکتی ہو ناں کہ اس دھوم دھڑکے اور جی جنجال رونق میلے سے میری جان بخشی کرادو۔"

وہ بیزاری کی انتہاؤں کو چھوتا ہوا التجائیہ کہہ رہا تھا۔ نگین اس کی دلگرفتہ اور مجروح حالت دیکھ کر رنجیدہ ہو رہی تھی۔

"ارسل! تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔"

اس کے دردآمیز لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔

"یہی تو کر رہا ہوں۔"

اس کا شکست خوردہ لہجہ اس کی جذباتی پسپائی کا غماز تھا۔

"اے ادھر کیا کر رہے ہو تم لوگ اتنی ٹھنڈ میں۔؟"

دادی بی کشاں کشاں ادھر چلی آئی تھیں۔

"یونہی دادی بی، ارسل کو کوئی پریشانی لاحق تھی۔ وہی پوچھ رہی تھی۔"

نگین کے کہنے پر ارسل نے تیزی سے سر اٹھا کر **تنبیہی** نظروں سے اسے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر بات بدل گئی۔

دراصل کوئی کاروباری مسئلہ درپیش ہے اسے۔"

"اے تو مسئلہ کیا یہاں برفیلی جگہ بیٹھ کر ہی حل ہو سکتا ہے۔؟"

دادی خاصی خفا تھیں۔

"بیمار پڑنے کا ارادہ تو نہیں ہے تم لوگوں کا چلو اندر۔!"

وہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر اندر لے آئی تھیں۔

تیرے لیے ہے میرا دل میری جان

ہوتے ہیں تو ہوں فاصلے درمیان

لاؤنج سے گزرتے ہوئے بے اختیار وہ ٹھہر گیا تھا۔ نبیل' جنید جمشید کی آواز کے سحر میں کھویا کشنز کے سہارے نیم دراز بڑے مست ومگن سے انداز میں ہاتھ اور پاؤں ایک ردھم کے ساتھ ہلا رہا تھا۔ بڑی متوازن اور خوب صورت آواز تھی۔ دھیما دھیما ٹھہرا ٹھہرا سا میوزک اتنی بے ساختہ سادہ سے جذبات کی ترجمانی کرتی شاعری۔

ارسل کو لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایں۔ ارسل بھائی آپ کب سے نبیل بھائی کی کلیکشن میں دل

چسپی لینے لگے۔؟''

جب اس نے دوسرے دن رفعت کو نبیل سے وہ کیسٹ لا کر دینے کو کہا تو وہ اچھی خاصی متحیر رہ گئی۔ نبیل لوگوں کو جب خبر ہوئی تو انہیں بھی خاصا استعجاب ہوا۔

''بھئی کوئی سچ مچ گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔''

نبیل نے بڑے وثوق سے کہا۔

''کوئی چکر ضرور ہے۔ گزشتہ دو تین ماہ سے ارسل بھائی کا رویہ بڑا مشکوک سا ہو گیا ہے۔''

رفعت سوچوں کے سمندر میں غرق متفکرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''یہ ہمہ وقت کس سوچ میں ڈوبے کھوئے کھوئے الگ تھلگ رہنا۔ اپنے آپ میں گم رہنا۔ دنیاوی ہنگاموں سے کنارہ کشی کیے رکھنا۔ اداسی، مایوسی اور تنہائی کے دورے پڑنا۔ بھوک پیاس اور گرمی سردی کے احساس سے عاری ہو جانا۔ یہ سب علامات ایک بہت اہم اور سنگین نوعیت کے مرض کی طرف نشاندہی کرتی ہیں۔''

''اور وہ مرض۔ مرض محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔''

نبیل نے علامات پر مفصل غور کرنے کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیا۔ پھر سر میں آکر گنگنانے لگا۔

میں مریض لادوا ہوں میری جاں غلط کہا ہے

تیرا مڑ کے دیکھ لینا، میرے درد کی دوا ہے

''ان دنوں وہ نگین سے بہت کلوز ہو رہے ہیں اور نگین بھی غیر معمولی طور پر ان کا بہت خیال رکھتی آ رہی ہے۔''

رفعت نے سوچتی ہوئی۔نظروں سے نبیل کی سمت دیکھا تھا۔

نبیل کے چہرے پر قدرے بے یقینی کے آثار تھے۔''میں نہیں سمجھتا کہ پس پردہ یہ بات ہے نگین پہلے بھی تو یہیں تھی۔''

''آگہی کا بھی ایک لمحہ ہوتا ہے۔عشق و محبت کے معاملات بھلا منصوبہ بندی سے طے۔ہوتے ہیں۔''

رفعت نے برا سا منہ بناتے ہوئے اسے لتاڑا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔''کیا کہہ سکتا ہوں لیکن یہ انکشاف مجھ سے ہضم نہیں ہو پا رہا۔''

''دادی بی بھی کل امی سے یہی کہہ رہی تھیں۔''

رفعت کے ذہن کے پردے پر کل کے مناظر روشن ہو گئے۔

''کیا کہہ رہی تھیں۔؟''

نبیل سنجیدگی سے متوجہ ہو گیا۔

''یہی کہ ارسل کی شادی کے لیے اس کی پسند کی لڑکی تو گھر میں ہی موجود ہے نگین ہی وہ لڑکی ہے جس سے ارسل شادی کرنا چاہتا ہے۔''

چائے کا کپ تھامے اندر آتی ہوئی نگین کے دل پر جیسے گھونسا سا لگا۔

ایک لمحے کو جیسے زمین آسمان اس کی نظروں میں گھوم کر رہ گئے تھے۔دھماکا ہی اتنا ہولناک تھا کہ وجود کے پرخچے اڑ کر رہ گئے تھے۔نبیل کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات درج ہو گئے۔

''میرا اب بھی یہ بات ماننے کو دل نہیں چاہ رہا۔بھائی کے دل میں کم از کم یہ خیال نہیں ہے۔اچھا امی نے کیا جواب دیا تھا۔''

انہوں نے کہا،ہمیں تو ارسل کی خوشی دیکھنا ہے۔اگر وہ نگین کو پسند کرتا ہے تو اس بات کو بتانے میں کیا حجاب ہے۔نگین ہمارے گھر کی لڑکی ہے۔یہیں پلی بڑھی ہے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے اب یہ بیل منڈھے چڑھ کر ہی رہے گی۔''نبیل نے خیال ظاہر کیا۔''

لیکن جانے کیوں مجھے ایک وہمہ سا پریشان کیے ہوئے ہے۔''

نگین اس واہمے کو سننے کے لیے نہیں رکی۔اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔سر تھام کر بیٹھی کتنی ہی دیر متفکر سی سوچتی رہی کہ اب کیا کیا جائے۔

''ہیلو۔کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ارسل ایاز گھر پر مل سکتے ہیں یا نہیں۔''

اس دن وہ کتابیں ارد گرد لان کی گھاس پر بکھرائے نوٹس بنانے کے

لیے ذہن کو آمادہ کرتی جانے کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی جب کیپٹن عاطف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے بوکھلا کر سر اٹھایا۔ وہ اس وقت فل یونیفارم میں تھا۔ اور سر کو احتراماً خم کیے بڑے شائستہ سے لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

"جی۔ جی میں پتا کر کے بتاتی ہوں۔"

وہ کچھ گھبرائے گھبرائے سے دھیمے انداز میں کہتی اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"میری پسند کی لڑکی مجھے ابھی نہیں ملی ہے جب ملے گی تو بتا دوں گا براہ کرم مجھے پریشان نہ کریں اور میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

دادی بی کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے ارسل کی الجھی جھنجھلائی بے بس سی آواز نے اس کے قدم بے اختیار جیسے زمین سے جکڑ دیے تھے۔

"ہم سمجھ گئے ہیں تم محض بہانہ بازی سے کام لے رہے ہو۔ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔"

دادی بی کا ترش ناراض لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا۔ کہ وہ ہر صورت ایک حتمی نتیجے پر پہنچنے کا تہیہ کیے ہوئے تھیں۔

"اور اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ ہم خود طے کریں تمہاری اس ٹال مٹول کی وجہ سے پہلے ہی بہت وقت برباد ہو چکا ہے۔"

"ارسل! باہر تمہارے کوئی مہمان آئے ہیں۔"

نگین نے بروقت دخل اندازی کر کے عارضی طور پر اس کی جان بخشی کرا دی تھی۔

وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تیر کی طرح کمرے سے نکل گیا تھا۔

عاطف کے کسی دوست کا ایز بلڈرز میں کوئی کام پھنسا تھا اس سلسلے میں وہ کئی بار ارسل سے ملنے آ چکا تھا۔

"کیا بات ہے ارسل بھائی! آپ کچھ الجھے الجھے دکھائی دے رہے ہیں ان دنوں۔؟"

عاطف بڑا صاف دل کا اور گھریلو سیاست کے داؤ پیچ سے خود کو بچائے رکھنے والا لڑکا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور انداز میں انتشار دیکھتے ہو۔ بالآخر اس نے پوچھ لیا تھا۔

"بس یار! وہی چکر ہے شادی بیاہ والا تمہیں پتا ہی ہے ایسے معاملات میں گھر والوں کے عجلت بھرے اصرار۔ بندے کو پریشان کرتے ہی ہیں۔ ہاں تم کہو۔؟"

وہ مبہم سے انداز میں جواب دے کر کام کی بات پر آ گیا تھا۔

''مس ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ارسل بھائی کو تو شادی بیاہ کی روایتی عجلت بازی پر پریشانی ہے آپ کس الجھن کا شکار نظر آتی ہیں۔؟''

کچھ روز بعد دوبارہ نگین کو ' خدیجہ ہاؤس' کے لان میں ایک ہی زاویے پر بیٹھے سوچوں کے سمندر میں گم دیکھ کر بالآخر عاطف سے رہا نہ جاسکا اور بے ساختہ ہی دریافت کر بیٹھا۔

''نن۔نہیں۔''

ایسی کوئی بات نہیں۔

وہ چونک کر شرمندہ سے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''کوئی بات تو ضرور ہے۔''

وہ اصرار آمیز انداز میں اس کا چہرہ جانچتے ہوئے بولا۔

وہ کچھ حواس باختہ سی ہوگئی۔ کیا دوربینی نگاہوں سے موصوف تاڑ رہے ہیں۔

''آپ تشریف رکھیے۔ میں ارسل کو بلا کر لاتی ہوں۔''

اس کی گہری، بھرپور نگاہوں کا اپنے چہرے کے گرد تعاقب اسے پزل سا کرنے لگا تو وہ کترا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر کی سمت بڑھی۔ اس کی بات سے بے خبر کہ دو آنکھیں اس کے ہر ہر قدم کی جنبش کو اپنے اندر فوکس کر رہی تھیں۔

پتا نہیں موسم۔۔۔۔بہانہ بن گیا تھا یا پھر وہ خود سے لڑتے اندر سے ٹوٹتا چلا گیا تھا۔ بخار کیا چڑھا اس کا پورا وجود جیسے اس بیماری نے جکڑ کر رکھ دیا۔ ہفتے بھر میں جسم کا سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا۔ بستر ایک بار کیا سنبھالا کہ پھر جیسے اس کا ہو کر رہ گیا۔ سارے گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اس کی دن بدن گرتی ہوئی نڈھال کیفیت دیکھ کر شہر کے تمام اچھے ڈاکٹر زآزما ڈالے تھے ایاز عباسی نے، مگر اس کی حالت میں ہنوز کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔

''جانے کس کی نظر لگ گئی میرے چاند سے بچے کو۔''

دادی باقراری سے اس کے تپتے جھلتے ماتھے پر بکھرے گھنے بالوں

کو ہٹا کر دکھ بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''دیکھو تو حالت کیا ہوگئی ہے۔ آدھا بھی نہیں رہ گیا۔ میرے بچے کچھ بتاؤ تو سہی۔ کچھ کہو تو۔ ٹھیک ہے شادی نہیں کرنا۔ چلو نہ کرو۔ جب تم کہو گے جس سے کہو گے کر دیں گے۔ یہ شادی تو خوشی کا نام ہے، میرے بچے کا دل نہیں مانتا تو ہم نے چولہے میں ڈالنی ہے ایسی خوشی پر چنداس طرح تو نہ کرو۔''

دادی بھی صدمے سے نڈھال ہو کر اس کی پیشانی چومتی اسے بہلا رہی تھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں دادی بی۔''

وہ نقاہت بھرے انداز میں بمشکل مسکرایا تھا۔

جانے کیوں خود کو سنبھالنا اتنا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ اتنا بے بس، اتنا بے اختیار تو وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

''خدا کی قسم نگین! میں بہت کوشش کرتا ہوں خود پر قابو پانے کی۔ مگر جانے کیا بات ہے دل سنبھلتا ہی نہیں ہے۔ کتنا سمجھاتا ہوں اس کو۔ یہ مانتا ہی نہیں۔ اپنی طلب سے دستبردار ہونے کی التجائیں سنتا ہی نہیں۔''

نگین کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ لیتے ہوئے اس کی شکوہ کناں نظروں کے جواب میں وہ بڑے بے اختیار سے، بے بس سے انداز میں

کہہ رہا تھا۔

''میں خود بھی خود سے تنگ آ چکا ہوں۔''

''اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بخار کی لالی واضح تحریر نظر آ رہی تھی۔''

اتنا بے اختیار میں کبھی نہیں ہوا نگین۔''

گہرے گہرے گرم سانس لیتے ہوئے اس نے تھکے تھکے انداز میں بیڈ کی پشت سے کمر ٹکا دی۔ نگین اس کے کمرے کی بے ترتیب چیزیں درست کر رہی تھی۔

''یوں لگتا ہے جیسے میں روز بروز اندر سے خالی ہوتا جا رہا ہوں۔ ہر امنگ، ہر جذبہ، مستقبل کے سہانے سپنے سب غبار راہ ہو چکے ہیں۔ کوئی تمنا اب دل میں سر ابھارتی ہی نہیں۔ کوئی خواہش مردہ جذبوں میں جان ڈالتی ہی نہیں۔ کوئی لالچ کوئی کشش پر جوش ہونے ہی نہیں دیتی۔ کیا کروں میں نگین۔ میں تو ہر طرف سے زنجیر پا ہو چکا ہوں۔''

وہ کہتے کہتے نڈھال ہو گیا۔ اور تکیے پر سر دھر کرے بے جان نظروں سے چھت کو گھورنے لگا۔

نگین چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش بھی کہاں رہی تھی اس کے جنونی جذبات سے بخوبی آگاہ جو ہو چکی تھی۔

''میں ایسا نہیں تھا۔ کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا ایسا بھی مقام آئے

گا۔ میں تو بڑا مغرور، بڑا جاہ و جلال والا، بڑا جارح ہوا کرتا تھا۔ کسی بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔ طوفان آ جائے۔ آندھیاں جھکڑ چلنے لگیں مصائب کی مجھے کوئی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ بڑے سے بڑے نقصان کو ٹھوکروں میں اڑا دینے کا خوگر ہوا کرتا تھا۔ پھر یوں اتنا بے اختیار، اتنا خود سے بے گانہ ایسا کیوں ہے نگین۔''

اس کا غصہ، تلخی، بے بسی بے چارگی اور جھلاہٹ سے لبریز ٹوٹا بکھرا لہجہ نیزے کی انی کی طرح نگین کے دل پر لگا تھا۔

''ارسل! ہمت کیوں ہارتے ہو۔''

اس نے بے اختیار اس کے قریب آ کر تسلی دینے کے سے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اسی لمحے دادی بی اندر داخل ہوئیں انہوں نے دونوں کو کچھ ایسے انداز میں دیکھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ چور سے بن گئے۔

''دادی بی! آپ ہی سمجھائیے کچھ اسے کچھ لے ہی نہیں رہا۔ سوپ بھی جوں کا توں پڑا ہے۔''

وہ جھجک کر اس سے دور ہو گئی تھی۔

''اسے سمجھاتی ہوں میں اچھی طرح۔ تم جمیلہ کی بات سن لو، بلا رہی تھی تمہیں۔''

پھر وہ اس کے بیڈ کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں اور اس کے

ماتھے کے بال سنوارتے ہوئے جھک کر لاڈ سے کہنے لگیں۔

''میرے بچے۔ میرے چاند چل تیرے دل میں اس کا خیال نہ سہی۔ پر وہ تو تمہارا خیال کرتی ہے ناں۔ دیکھ کتنی پریشان اور بے چین رہتی ہے تیرے آرام و سکون کے لیے۔ اپنے دکھ درد بھی تو، تو اسی سے کہتا ہے ناں۔ وہ تجھے سکھی رکھے گی میرے بچے۔ یوں بھی بن ماں باپ کی ہے۔ اور اس کا ہے ہی کون ہمارے سوا دیکھ کس طرح اس گھر کی اور گھر کے لوگوں کی خدمت کرتی ہے۔ پیار کرتی ہے سب سے، پھر تیرے لیے کتنا جان ماری کرتی ہے۔''

''دادی بی۔''

ارسل سناٹے میں رہ گیا تھا۔ تو اس کا مطلب ہے، نگین کی مجھ پر خصوصی توجہ کی وجہ یہ تھی۔ یوں تو وہ شروع سے اس سے بہت اچھی طرح پیش آتی رہی تھی۔ اس کے مسائل، آرام و سکون اور کھانے پینے کا دھیان رکھتی۔ اس کے معاملات میں دلچسپی لیتی تھی۔ اس لیے جب زرشہ والا واقعہ ہوا تو بغیر وضاحت کے معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ اور اس کے اندرونی احساسات سے باخبر ہو گئی۔

''تو کیا اس خیال کے پیش نظر وہ اس کے اتنا قریب آ گئی تھی۔؟''

ارسل کے ارد گرد برف کی دیواریں سی کھڑی ہو گئیں۔

وہ تو پہلے ہی نارسائی کے دکھوں کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ اب کسی

کے دل کا مجرم بننے کا انکشاف اور زیادہ تشنگی بڑھانے لگا۔

"کیا نگین نے اس سلسلے میں آپ سے کچھ کہا ہے۔"

اس کی آواز کنویں سے برآمد ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"لے بھلا۔ ایسے معاملات میں بچیاں اپنے منہ سے اقرار کرتی ہیں کبھی۔؟"

دادی بی کو اس کی ناسمجھی پر اور کم عقلی پر افسوس ہوا۔

"ارے بچے یہ سب کچھ ان کے رویوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ بات صرف سمجھنے کی ہوتی ہے۔"

دادی بی اسے سمجھا رہی تھیں۔

اسکو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ ایک نیا بوجھ دل پر آن پڑا تھا۔ "اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر وہ بھی تو انہی مراحل سے گزر رہی ہوگی جن سے میں گزر رہا ہوں۔ حسرت، ملال تشنہ کامی، بے بسی، خود اذیتی کے اس سمندر میں جانے کب تک بھٹکنا مقدر بن چکا ہے۔ تو کیا نگین بھی۔؟"

عجیب دل گرفتہ سی سوچوں نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔

کتنے ہی دن یونہی بیزار کن انداز میں بستر پر پڑے گزرتے چلے گئے۔ اس دن کچھ طبیعت سنبھلی تو بے اختیار قدم "عائشہ ہاؤس۔" کی سمت

جانے کو مچل گئے۔

"کیسے مزاج ہیں نانی بی۔؟"

ذرا سا فاصلہ طے کرنے سے ہی اس کی سانس پھول گئی تھی۔ عائشہ بیگم نے پہلے متعجب سا ہو کر پھر نہایت غور سے اس کے سراپے کو جانچا۔ پیلا زردہ اذیت کے تاثرات سے سجا چہرہ، بجھی بجھی آنکھیں، بڑھی ہوئی شیو، ملگجے کپڑے، نحیف کمزور نڈھال سا وجود، تھکا تھکا بکھرا ٹوٹا بیمار انداز۔

"یہ کیا حالت ہوگئی ہے تمہاری۔"

اُڑتی اڑتی ان کے کان میں تو پڑی تھی اس کی بیماری کی خبر لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسی حد تک بیمار ہوگا۔

"بیٹھو ادھر۔ کیوں نکلے اتنی کمزوری کے عالم میں باہر؟ تمہیں ابھی آرام کرنا چاہیے تھا۔"

اس کی حالت دیکھ کر نانی بی کے دل میں قدرتی طور پر ہمدردی جاگ اٹھی تھی۔

وہ صوفے کی پشت تھام کر لڑکھڑاتا ہوا گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ نانی نے رشید سے کہہ کر اس کے لیے پانی منگوایا۔

"آپ کیسی ہیں نانی! ٹھیک ہیں۔"

سانسیں درست کرتے ہوئے اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا

کر پوچھا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔مگر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟"

ان کے لہجے میں سچ مچ تشویش تھی۔

"بس نانی۔!"

اس نے گہرا سانس لیا۔

"نانی قاہرہ سے کچھ خیر خبر ملی۔؟زرشہ کیسی ہے۔"

بالآخر وہ مدعا لبوں پہ لے آیا جس کے لیے اتنی تکلیف برداشت کر کے چل کے ادھر آیا تھا۔

"ٹھیک ہے اب۔خط آیا تھا اس کا۔"

نانی کے لہجے میں دنیا بھر کا پیار امڈ آیا تھا زرشہ کے ذکر پر اس کی یاد ہی اتنی پیاری تھی کہ وہ ارسل کے منہ سے اس کا نام اور سوال سن کر غصہ کرنا بھول ہی گئیں۔

"منیب کی شادی کی تصویریں بھی بھجوائی ہیں۔"

"شادی ہو گئی ان کی۔"

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔ایک لمحے کو اندھیرا سا چھا گیا آنکھوں کے آگے۔

"ہاں۔وہ تو پہلے سے طے تھی۔بس منیب کو ضد تھی کہ بہن آئے گی

تو ہی وہ سب کچھ اپنے ہاتھ سے کرے گی۔اس لیے اسے لینے آیا تھا۔ٹھہرو میں تصویریں لا کر دکھاتی ہوں تمہیں۔"

"بہن۔شادی طے تھی۔؟"

تحیر واستعجاب نے اس کے اعصاب سلب کر کے رکھ دیے تھے۔

"تو۔تو۔وہ سب جو زرشہ نے کہا یا مظاہرہ کیا وہ سب کچھ محض ردعمل تھا؟بدلہ تھا۔؟"

اس کے ارد گرد دھماکے سے ہونے لگے۔

نانی تصویریں لے آئی تھیں۔وہ ہر تصویر میں نمایاں تھی۔کہاں دولہا سے نیگ وصول کرتے ہوئے،کہیں دلہن کے گرد بازو پھیلائے ہوئے، کھلکھلاتی ہنستی مسکراتی سجی سجائی زرشہ جیسے مجسم قیامت بن کر اس کے سامنے آئی تھی۔

"لکھا تھا ادھر یونیورسٹی میں ہی داخلہ لے لیا ہے اس نے،میں نے توسین سے کہا تھا اب کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کا گھر بسانے کی سوچو مگر وہ پچھے پہ ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی۔کہاں مانتی ہے کسی کی۔"

اس سے زیادہ دیر ادھر رکا نہ گیا۔اس کے اعصاب جو جواب دینے لگے تھے۔سو وقت تمام سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں آ گیا اور بے دم سا

ہو کر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ عجیب سیال دھواں سا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا اپنے اندر۔ اتنی تپش اور گھٹن سی لگ رہی تھی جیسے کسی نے بھٹی میں ڈال دیا ہو۔ یہ نسل در نسل منتقل ہونے والی تلخیاں دشمنیاں اور عداوتیں بعض اوقات کس قدر جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان جو کچھ بھی تھا مذاق تھا یا حقیقت بہر حال اسی روایتی دشمنی کی نذر ہونا تھا۔ انجام تو بہر حال نارسائی ہی تھا۔ اسے بھی خبر تھی۔ میرا یقین کر بھی لیتی تو بھی مقدر سے یقین کون دلواتا۔ کون دونوں بڑوں کو قائل کرتا۔ دیوار تو ہمیشہ حائل رہنا تھی میں اسے اپنا کر اپنے باپ کے زخموں پر نمک چھڑک سکتا تھا؟ وہ مجھے قبول کر کے اپنے نانی کی ہار کا تماشا دیکھ سکتی تھی۔

نہیں! یوں بھی جدا تو ہونا ہی تھا۔ یہ بدگمانیاں جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہیں۔ شاید اسی لیے ہیں کہ ان کے وجود کے پیچھے پناہ لے کر زخمی مجروح جذبات کی تسکین ہو سکے غنیمت ہی تو ہیں یہ گلے شکوے جو کسی نہ کسی طرح قرار بخش دیتے ہیں جنہیں اس کی ذات سے منسوب کر کے بلبلائی انا کو رام کر لیا جاتا ہے۔ مگر۔

مگر یہ دل۔ یہ احساس نارسائی اتنا تنگ کیوں کرتا ہے۔ بھولتا کیوں نہیں ہے دل کی۔ شکست خوردگی کا وہ منظر۔ یہ کیوں نہیں سمجھتا دل کہ جو

ہوا سو ہوا۔ کسی اور طرف کیوں دھیان نہیں بٹتا۔ میرے اندر اتنی جسارت کیوں پیدا نہیں ہوتی کہ خود پر ظلم در ظلم کرنے کا سلسلہ ختم کر سکوں۔ ہر راحت، ہر دل خوش کن ساعت، ہر قرار اس کے حصول اس سے وابستگی کے ساتھ کیوں مشروط ہو کر رہ جاتا ہے۔

تو کیا یہ طے ہے کہ اب عمر بھر نہیں ملنا
تو پھر یہ عمر بھی کیوں تجھ سے گر نہیں ملنا

رہ وفا کے مسافر کو کون سمجھائے
چلو زمانے کی خاطر یہ جبر بھی سہ لیں
کہ اب ملے جو کبھی ٹوٹ کر نہیں ملنا

یہ کون چپکے سے تنہائیوں میں کہتا ہے
مرے بغیر سکوں عمر بھر نہیں ملنا

جدا تو جب بھی ہوئے دل کو یوں لگا جیسے
کہ اب گئے تو کبھی لوٹ کر نہیں ملنا

"اوہو۔ اس قدر ناامیدی' یاس کی کیفیت چچ چچ۔"

نبیل اس کے پاس آ کر بیٹھتا ہوا اظہار افسوس کر رہا تھا۔

ارسل مکمل طور پر گیت کے بولوں میں گم تھا۔ کس قدر دل میں اتر جانے والی غزل تھی۔ ایک ایک لفظ سچ تھا۔ اس کی سوچوں کا عکاس تھا۔

"ارسل بھائی!"

اب کے نبیل سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ ایسے تو ہرگز نہیں ہوا کرتے تھے۔"

وہ بھائی تھا۔ اس کی رگ رگ سے واقف اس کے مزاج کے بدلتے موسموں سے آگاہی رکھتا تھا۔

"آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں بھائی۔ مجھ سے شیئر کر لیجئے۔"

اس نے نبیل کے پرخلوص انداز پر نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

نبیل کے چہرے پر اس کے لیے محبت' تفکر اور اعتبار کے جذبات تھے۔

ارسل دھیرے سے مسکرا دیا اور اس کے کندھے تھپتھپانے لگا۔

"دادی بی جو کچھ کر رہی ہیں کیا اس میں آپ کے دل کی سچی رضا شامل ہے۔؟"

نبیل بالآخر اپنے دل میں چبھتے شور مچاتے استفسار کو زبان پر لے آیا۔

ارسل نے بے چارگی سے اس کی سمت دیکھا۔

"نبیل میرا دل اب یہاں نہیں لگتا۔ سوچ رہا ہوں کہیں نکل جاؤں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں۔"

نبیل نے بے تحاشا چونک کر اس کا رنج و کشمکش سے اٹا چہرہ دیکھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ یہ اس کے پرجوش، ہمہ دم آمادہ بہ شرارت سرگرم عمل تندرست و توانا ہشاش بشاش بھائی کا چہرا تھا؟ یہ تو زندگی کی بہاروں سے روٹھا ہوا چہرا تھا۔ ایک ایسا چہرا جس پر سے خوشیوں کی رمق غائب ہو چکی تھی۔ پژمردہ مرجھایا منتشر سا خود سے بے گانہ چہرا۔

"اگر آپ کو پسند نہیں ہے نگین تو دادی بی سے کہہ دیجیے۔"

بہت دکھ بھرے انداز میں اس نے دھیمے سے مشورہ دیا۔ اس نے تھکی تھکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر بغیر کچھ کہے کھڑکی سے باہر نگاہیں جما دیں۔

"میں کہہ دیتا ہوں دادی بی سے۔"

نبیل نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے اس کی سمت۔ تائید طلب

نظروں سے دیکھا۔

کچھ دیر۔۔۔ باہر جھانکتے رہنے کے بعد ارسل خاموشی سے اس کی طرف مڑا۔

"تم اگر میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو اتنا کر دو کہ انہیں کہو میرے حال پر چھوڑ دیں مجھے۔"

نبیل دل ہی دل میں ایک واضح فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اس رات ایاز عباسی سے علیحدگی میں کھل کر بات کی۔

"بابا جان! یہ ارسل بھائی کی پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ آپ نہیں جانتے وہ کس قدر ناخوش ہیں اس فیصلے سے۔ یوں بھی ان کی جو حالت ہے اس کے پیش نظر ہمیں خوامخواہ شادی کے لیے ان پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔ ڈاکٹرز نے بھی تو یہی کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کچھ عرصے کے لیے وہ کوئٹہ چھوڑ کر شمالی علاقہ جات سیر و تفریح کے لیے نکل جائیں تو بہتر ہوگا۔ شاید آب و ہوا کی تبدیلی ان کی صحت پر مثبت طریقے سے اثر انداز ہو!"

ایاز عباسی جبر و تحکم سے اولاد کے لیے فیصلے صادر کرنے والے والدین میں سے نہیں تھے۔ وہ خود بھی بڑے متحمل مزاج اور ٹھہری ہوئی پرسکون طبیعت کے مالک تھے۔ اور جذبات کے بجائے حقائق کو سامنے رکھ کر

فیصلہ کن قدم اٹھانے والوں میں سے تھے۔ ارسل کی دن بدن بگڑتی ہوئی صحت پر وہ خود بھی بہت زیادہ پریشان اور فکرمند تھے۔

''اچھا ہوا تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ امی جان اور جمیلہ سے کہہ کر شادی بیاہ والا قصہ فی الحال ختم کرا دوں۔ ارسل کی حالت جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے قطعی تسلی بخش نہیں ہے۔ وہ تو اتنا ایکٹو اور اتنا نکتہ رس ذہن رکھنے والا ہوا کرتا تھا۔ اتنا نحیف اور زندگی سے بیزار تو میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ۔ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔ جس نے اس کے فولادی اعصاب اور جوان کڑیل بھرپور وجود کو یوں توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اتنی تکلیف میں میں نے اسے کبھی نہیں پایا۔''

ایاز عباسی کے چہرے پر تفکر اور پریشانی کے آثار واضح طور پر درج تھے۔

پھر یوں ہوا کہ ان کے سمجھانے بجھانے پر اور کچھ ارسل کی موجودہ حالت کے پیش نظر دادی بی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئیں اور ارسل موقع پاتے ہی شمالی علاقہ جات کی سمت نکل گیا۔ اور پورے تین ماہ تک ادھر ہی رہا۔

سب ہی کو یقین تھا کہ لوٹے گا تو پہلے کی طرح زندگی سے بھرپور

ارسل ایاز کے روپ میں ڈھل کر نکھر چکا ہوگا۔ مگر جب اس کی واپسی ہوئی تو دیکھ کر ہر کوئی دل تھام کر رہ گیا۔

''ارسل! میرے بچے۔ ارے یہ تجھے کس کی نظر کھا گئی۔''

دادی بی کا کمزور دل زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکا وہ چکرا کر گر پڑی تھیں۔

اس کا مضبوط کسرتی جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ چہرہ ایک دم زرد وسفید بے جان۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور نقاہت اس قدر کہ چار قدم کے بعد ٹانگیں کانپنا شروع ہو جاتی تھیں۔ خدیجہ ہاؤس'' والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ایاز عباسی نے اپنی تمام تر کاروباری مصروفیت ترک کر کے اسے شہر کے نامور ڈاکٹر سے چیک کرایا اور پھر جو کچھ ڈاکٹر نے بتایا اسے سن کر ان کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

''نہیں۔ نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہو گئی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ ہراساں سے ڈاکٹر صمد کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر صمد نے تسلی دینے کے انداز میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ تو بہت سمجھدار، بہت حوصلہ مند نظر آتے ہیں عباسی صاحب!''

''میری ساری عمر کی کمائی موت کے موذی پنجے تلے آن پہنچی میں صبر وضبط اور حوصلے کا مظاہرہ کیسے کروں۔؟''

ان کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

''میں پھر کہوں گا ڈاکٹر صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو ساری عمر کبھی موسمی نزلہ وزکام اور بخار کے علاوہ کوئی دوسری بیماری نہیں ہوئی پھر کیسے کینسر؟

غم واندوہ کی کیفیت نے اس سے آگے کچھ کہنے کی ہمت سلب کر لی

ڈاکٹر صمد نے تسلی کے لیے دوبارہ ان کے شانے دبائے کہ وہ ان کے پرانے جاننے والے بھی تھے اور بڑی اچھی سلام دعا تھی۔ دونوں کے درمیان۔

''یہ بھی ایک بیماری ہے دیگر بیماریوں کی طرح، گو سنگین نوعیت کی ہے دوسروں کے مقابلے میں مگر سائنس کے کمال کی بدولت اب اس کی سنگینی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔ سائنس نے اس جان لیوا مرض کا علاج دریافت کرلیا ہے۔ پھر ارسل تو یوں بھی ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ آپ لوگ ہمت وحوصلے سے کام لے کر اسے خود کو بلڈاپ کرنے اور از سرنو اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنے میں سپورٹ دیں۔ انشاء اللہ وہ جلدی صحت یاب ہو

جائے گا۔ مایوسی کی ایسی کیا بات ہے۔ کیا انسان کو بیماریاں نہیں ہوتیں۔؟''

ایاز عباسی نے بڑی بے اعتباری سے سر اٹھا کر تصدیق طلب نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

''ہاں ہاں بھئی۔ میرا یقین کریں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ تو پڑھے لکھے اور متحمل مزاج شخص ہیں میں قطعی وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ اگر ارسل ایک بار تہہ دل سے زندگی کی طرف لوٹنے کا عزم کرلے تو چند ہفتوں کے اندر اندر وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے گا۔ اور اس بیماری کا نام ونشان بھی نہیں رہے گا۔ ابھی تو بالکل ابتدائی اسٹیج ہے۔''

ارسل کو معلوم ہوا تو ایک دھیمی اور سکون مسکراہٹ چہرے پر در آئی۔ اس کا انداز ایسا سرسری تھا گویا ڈاکٹر نے موسمی نزلے زکام کی تشخیص کی ہو۔

''میرے بچے۔ تو نے اتنی سی بات دل پر لے لی۔ ارے شادی تو تیری خوشی کے لیے تھی۔ تیرے سکون وآرام کے لیے تھی۔ نہیں دل تھا تو کہہ دیتے۔ تیری خوشی کے لیے تو میرے چاند میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

دادی بی کی آنکھیں سیل رواں کی مانند بہہ نکلی تھیں۔

ایک مجروح تبسم ان کے لبوں کو چھوتا گزر گیا۔

''میری خوشی کے لیے آپ عداوت کی وہ فصیل گرا سکتی تھیں۔ نہیں

بھلا آپ اپنی انا کے پرچم کیسے سرنگوں ہوتے دیکھ سکتی تھیں۔؟"

"کون ہے وہ لڑکی۔ کس بادشاہ کی بیٹی ہے؟ مجھے بتاؤ بچے۔ کیا سات سمندر پار رہتی ہے۔ کیا ساتویں آسمان پر رہتی ہے۔ مجھے بتاؤ کون ہے وہ جس نے میرے ہیرے جیسے انمول بچے کو رول دیا۔" جمیلہ خاتون رو رو کر پاگل ہو رہی تھیں۔

ایک لمحے کو غم کی شدت سے پھٹتے دل سے دادی بی جمیلہ خاتون اور رفعت ندرت کی سسکیاں سنتی ساکت کھڑی نگین کے لب پھڑپھڑائے کچھ کہنے، کچھ منکشف کرنے کو بے تاب ہوئے لیکن اسی لمحے ارسل نے نگاہ اٹھا کر نظروں ہی نظروں میں مہر بہ لب رہنے کی تنبیہہ کی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ چبا کر رہ گئی۔

اب فائدہ بھی کیا تھا۔ عداوت اور نفرت کے اس زہریلے اژدھے نے دو زندگیاں نگل لی تھیں۔ فریقین کے مابین تنفر و تحقیر کی یہ زنجیر کیسے حائل ہوئی جان سے زیادہ عزیز رشتے کی حرمت کیسے پارہ پارہ ہوئی یہ قصہ بھی اپنی جگہ ایک عظیم دکھ بھری کہانی سے کم نہیں تھا۔

"خدا کے لیے خدیجہ! اب چھوڑ دو پیچھا ان کتابوں کا بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔"

بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا تو جھلا کر ریک میں سر دیے مختلف کتابوں کو الٹتی منہمک اور مگن خدیجہ پر برس پڑی تھی۔

"بس تھوڑی دیر صبر کرو۔"

نوٹس بنانے کے لیے مطلوبہ کتاب ہاتھ میں آتے ہی وہ بے تابی سے ان کے اوراق پلٹنے لگی۔

"اگر نوٹس آج کی تاریخ میں نہیں بنیں گے تو

قیامت نہیں آ جائے گی۔؟"

وہ بھنا کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔

"آہستہ بھئی آہستہ۔ یہ لائبریری ہے۔"

خدیجہ نے مڑ کر اس کے بلند لہجے پر ٹوکا۔

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہارے نوٹس۔"

اس نے تیزی سے اس کے ہاتھ سے کتاب چھینی اور دوسرے ہی لمحے ساتھ والے ریک میں پھنسا کر اس کا ہاتھ کھینچنے لگی۔

"عائشہ عائشہ۔ کچھ ہوش کی دوا لو۔ ارے بھئی ٹھہرو تو یہ کتاب اتنی دیر کی تلاش کے بعد ملی ہے۔ اسے کہیں محفوظ تو کر لینے دو۔ کدھر پھینکی ہے۔"

"مل جائے گی پھر دوبارہ۔ پہلے کینٹین چل کر بھوک تو مٹا لیں۔ ہر وقت کتابی کیڑا بنے رہنے کا شوق تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا پہلے ہی رنگ ضرورت سے زیادہ گہرا ہے۔ پڑھ پڑھ کر پوری کلو بیگم بن گئیں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

وہ اسے گھسیٹتی ہوئی باہر لے جانے کی سعی کر رہی تھی۔

"عائشہ پلیز۔ یار۔ اچھا ٹھیک ہے چلتے چلتے ہیں کینٹین مگر پہلے مجھے اس کتاب کو کہیں سنبھال کر رکھ لینے دو۔"

"کوئی نہیں لے کے جاتا۔ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے بعد ہم آ رہے ہیں؟"

"ایکسکیوزمی۔ جب تک آپ دونوں کے درمیان کوئی تصفیہ نہیں ہو جاتا میں تب تک یہ کتاب استعمال کر سکتا ہوں۔"

ایک سنجیدہ اور متین آواز سماعت سے ٹکراتے ہی دونوں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا تھا۔ اور پھر جیسے چند ثانیے کو دونوں مبہوت سی رہ گئیں۔

ظاہری بات تھی۔ یونیورسٹی تھی۔ یہاں ہر رنگ روپ کی لڑکیاں اور لڑکے روز دیکھنے میں آتے تھے۔ ہر مزاج اور صورت و سیرت کے حامل لوگوں سے ملاقات ہوتی تھی۔ جن میں بہت سے خوش شکل اور حسین مرد بھی شامل تھے۔ لیکن اس بھوری شفاف آنکھوں والے سرخ و سفید

تر و تازہ رنگت لیے چہرے پہ بے تحاشا سنجیدگی
وقار، تدبر اور جاہ و جلال کی آمیزش لیے شخص میں
مردانہ حسن اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ فی
الوقت دیکھنے والا ایک لمحہ کو دنگ رہ جاتا تھا۔
خوبصورتی تو بہر حال مل ہی جاتی ہے لیکن کشش
آمیز خوبصورتی بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی
ہے۔ اور وہ شخص ان چند خوش نصیبوں میں سے
ایک تھا۔ لیکن شاید اسے اپنی اس خوش قسمتی پر کوئی
فخر و ناز نہیں تھا۔ یا پھر شان بے نیازی دکھا کر اپنی
مارکیٹ ویلیو مزید بڑھانا چاہتا تھا۔

"تو پھر اجازت ہے؟ دونوں کے چپ رہنے پر
بالآخر کچھ توقف کے بعد کتاب اٹھاتے ہوئے اس نے قدم
بڑھانے سے پہلے رسماً دوبارہ پوچھا تو وہ ہوش میں آ گئیں۔

"لیکن بات یہ ہے جی کہ یہ کتاب آل ریڈی
ہمیں بہت مشکل سے ملی ہے۔ ہمیں ابھی نوٹس
بنانا ہیں۔"

خدیجہ نے بتایا۔

"آپ شاید کہیں جا رہی ہیں۔ اتنی دیر کے لیے
میں اس سے کچھ دیکھ لیتا ہوں۔ میں ادھر لائبریری میں
ہی ہوں۔ آپ جب واپس آئیں گی تو مجھ سے لے لیجئے
گا۔"

نہایت شائستگی سے اس نے حل بتایا تھا جس پر
کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

"ٹھیک ہے ہم لوگ آدھے گھنٹے تک آ رہے
ہیں۔ اس دوران ــــ آپ اپنے مطلب کی چیز اس میں
دیکھ لیجئے۔ ویسے آپ کی تعریف۔؟"

عائشہ اپنا فطری اشتیاق نہ دبا سکی تھی۔

"طارق عباسی۔ ابھی حال ہی میں جامعہ کراچی
سے ادھر مائیگریٹ ہو کر آیا ہوں آپ ہی کے ڈیپارٹمنٹ
میں۔"

اس نے مختصراً اپنے متعلق بتایا تھا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ چلو عائشہ!"

"کیا خوابناک چیز تھی بھئی۔"

باہر نکل کر کینٹین کا رخ کرتے ہوئے عائشہ نے

تحسین آمیز لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔ اتنا غیر معمولی مردانہ حسن بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔''

خدیجہ نے بھی ایمانداری سے اعتراف کیا تھا۔

اس دن کی ان کی فراخدلی پر اس نے دوسری ملاقات میں مختصراً ان کا شکریہ ادا کیا پھر گاہے بگاہے آتے جاتے ہائے ہیلو ہونے لگی ۔لیکن وہ دوستی استوار کرنے میں حد درجے محتاط نظر آتا تھا۔ خصوصاً لڑکیوں سے بہت کترایا سا رہتا تھا ، پڑھائی کے بعد اس کا واحد مشغلہ مباحثوں میں شرکت تھی۔ وہ بلا کا شعلہ بیان خطیب اور مقرر تھا۔ صنف نازک کا پورا قبیل اس پر مرتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ ایسے موقعوں پر خوبصورتی سے کنی کترا جایا کرتا تھا۔

''یار! وہ ساری دنیا کی زنانیوں سے پرہیز ۔'' کرتا ہے لیکن ہمارے ساتھ جب بھی

علیک سلیک کرتا ہے بڑی عزت سے پیش آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ کہیں وہ تیرے ان سنہرے نینوں اور دراز زلفوں پر تو نہیں مرمٹا۔؟''

اس دن خدیجہ سرتاپا ستائشی نظروں سے اس کا خوب صورت مرمریں سراپا دیکھتے ہوئے چھیڑ رہی تھی۔

عائشہ کے گلابی گالوں پر ایک خوبصورت سا رنگ آکر گزر گیا۔

''چل بکواس نہ کر وہ کہاں کسی کو گھاس ڈالنے والا ہے۔ تو ہے ناں پڑھاکو بیگم اور ذہین وفطین اوپر سے وہ بھی ٹھہرا لائق فائق۔ تجھ سے کتابی بحث ومباحثہ کرنے کا چسکا پڑ گیا ہے اس لیے ہم سے ٹھیک طرح سے بات کرتا ہے۔''

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں ایک دوسرے پر کھلتی گئیں۔ وہ بھی اسے جان گئی تھیں اور طارق عباسی بھی سمجھ چکا تھا کہ وہ کس قسم کی لڑکیاں ہیں۔ ان میں خیر خیریت کے بعد پڑھائی کے اور یونیورسٹی میں

ہونے والے سرگرمیوں کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔

پھر فائنل ایگزامز شروع ہو گئے۔

اس دن آخری پیپر تھا۔ خدیجہ کو گھر میں کوئی ضروری کام تھا وہ پیپر دیتے ہی نکل کھڑی ہوئی۔

عائشہ کے ڈرائیور کو تھوڑا لیٹ آنا تھا۔ وہ انتظار میں کھڑی تھی جب طارق عباسی اس کے نزدیک رکا۔ پیپر کے متعلق پوچھنے کے بعد سرسری سے انداز میں اس نے خدیجہ کے بارے میں پوچھا۔

''وہ ابھی ابھی نکل گئی ہے۔ اس کے کچھ مہمان آنا تھے گھر میں ضروری۔''

''چلیں۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ مجھے دراصل آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بالآخر وہ گویا ہوا۔ ہزار خود پر قابو پانے کی سعی کے باوجود اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''کیا آپ مجھے خدیجہ کے گھر کا ایڈریس بتا سکتی ہیں۔؟''

''جی۔''

وہ اتنی غیر متوقع بات پر بھونچکا سی رہ گئی۔

"میری والدہ اور بہنیں آنا چاہ رہی ہیں ان کے گھر اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ لڑکے کی ماں اور بہنیں لڑکی والوں کے ہاں کیوں جاتی ہیں۔؟"

"جی۔!"

کوئی اس پر بم بھی بلاسٹ کر دیتا تو بھی شاید وہ اتنی ہوش سے بیگانہ نہ ہوتی جتنی اس کی بات سن کر ہوگئی تھی۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ ایسا بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ اتنی عام سی سانولی سی معمولی سی لڑکی کو یہ اتنا شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والا سجیلا بندہ پروپوز کر رہا تھا۔

"میں بہت پہلے آپ لوگوں سے مل کر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ خدیجہ کا مزاج اور عادات میرے مزاج سے بہت ہم آہنگ ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ اس لیے شروع نہیں کیا کہ امتحانات سے نپٹ لیا جائے۔ پھر ایسے رشتے استوار کرنا بھی اچھا لگے گا۔"

وہ اس کی قلبی کیفیت سے بے خبر اپنے مخصوص سنجیدہ و شائستہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

اس پوری رات وہ سوجی ہوئی ملول آنکھیں لیے آئینے کے سامنے کھڑی پاگلوں کی طرح اس سے سوال کرتی رہی۔

"بولو کیا اس کم رو عام سی لڑکی کا چراغ میرے حسن کے تند و تیز طوفان کے آگے چل سکتا تھا؟ نہیں ناں۔ میں تو اس کے مقابلے میں لاکھ کروڑ درجے زیادہ خوبصورت ہوں۔ پھر اس دیومالائی حسن رکھنے والے شہزادے کو یہ خبر کیوں نہ ہوئی کہ میرے دل کے مندر میں اس کی مورتی سجی ہوئی ہے۔ وہ مجھے اپنی دیوداسی بنا لیتا۔ ساری عمر ان قدموں میں گزار دیتی۔ اپنا تن من نچھاور کر دیتی۔ ایک بار میری طلب تو کر کے دیکھتے کیسے محبت کا ابر بن کر برس جاتی۔"

مگر صبح اس کی خدیجہ سے ملاقات ہوئی تو ایک لفظ کہے بغیر وہ اس کا چہرا دیکھنے لگی۔ آخر اس میں ہے کیا

چیز جس نے اس دیوتا کو پجاری کے مقام پر آنے پر مجبور
کر دیا۔

"کیا سینگ تو نہیں نکل آئے کہیں؟" اس کی
نظروں کے انہماک پر وہ شرارت سے اپنا سر ٹٹولنے لگی۔
مگر عائشہ کے چہرے پر چھایا ناگوار سا پرتپش سکوت جوں
کا توں موجود رہا۔

پھر اسنے بے تاثر سے برفیلے انداز میں طارق
عباسی کا مدعا اس تک پہنچا دیا۔ اور اس بات کو سن کر لمحوں
میں رنگوں کی جو دھنک خدیجہ کے چہرے پر بجی اس نے
اندر تک عائشہ کی نس نس بھڑکا دی۔

"ارے نہیں بھئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو
سمجھتی تھی کہ وہ تم میں انوالو ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ۔"

"تم اب جھوٹ نہیں بولو۔ جانتی ہوں میں، تم
کتنی گھنی ہو۔ سب جانتی تھیں، وہ کس لیے لور لور ہمارے
پیچھے پھرتا ہے۔ بس مجھے بے وقوف بنانا تھا۔"
تلخی سے اس نے کہا۔

"کیا بات کرتی ہو عائشہ۔"

خدیجہ خفا ہونے لگی۔

بھلا مجھے تم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔
اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تمہیں ضرور بتاتی!"

"اچھا اگر اتنا ہی میرا خیال ہے تو تم ایک کام
کرو۔ اس پرپوزل سے انکار کر دو۔"

اس کی خودغرضانہ شرط پر خدیجہ دھک سے رہ گئی۔

"مگر کیوں۔؟"

"بس۔ میں کہہ رہی ہوں ناں۔ ویسے بھی
ایک بات یاد رکھنا۔ جن بیویوں کے شوہر بہت حسین
ہوتے ہیں، وہ ساری عمر انگاروں پہ سوتی ہیں۔ تمہارا
ہی بھلا ہوگا۔ یوں بھی اتنے خشک مزاج اور سرد مہر
شخص کے ساتھ زندگی بھر ساتھ نبھانا بہت مشکل ترین
امر ہے۔"

"تم جانے کس وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو جبکہ
میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم خوامخواہ پٹی ہو
رہی ہو۔"

"ہاں ہاں تم تو یہی کہو گی کہ میں تم سے جلیس

ہو رہی ہوں۔"

عائشہ چیخ سی گئی۔

"تمہارا انداز تو یہی کہہ رہا ہے۔"

خدیجہ نے بھی لگی لپٹی نہ رکھی۔

"کیونکہ تم شروع سے یہ یقین کیے بیٹھی تھیں کہ وہ تمہارے لیے آتا ہے ہمارے پاس۔"

ہونہہ۔ مائی فٹ۔ ایک سے اچھے ایک رشتے ہیں میرے لیے۔ آخر مجھ میں کس چیز کی کمی ہے۔"

اکڑتے ہوئے مغرور سے انداز میں کہہ کر اس نے ناک چڑھائی تھی۔

"بہت افسوس ہوا مجھے تمہاری خراب ذہنیت پر۔"

"میں۔۔۔تمہارے دل کا چور سامنے لائی ہوں اور کوئی بات نہیں۔"

خدیجہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے معاملے کو رفع کرنا چاہا مگر عائشہ نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔

خدیجہ بھی زیادہ عرصہ برداشت کی پٹری پہ نہ چل سکی۔ اور پھر یوں ہوا کہ حسد اور بدگمانی کی یہ خلیج بڑھتے بڑھتے ان کی بچپن کی اتنی گہری دوستی کو اپنے اندر غرق کر کے لے گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی روادار نہ رہیں۔ حتیٰ کہ عائشہ اس کی شادی میں بھی شریک نہ ہوئی۔ خدیجہ کو بھی زیادہ ملال نہیں ہوا کہ نہیں تو نہ سہی۔ کہاں تو ایک دوسرے کے بغیر ایک منٹ کو چین نہیں پڑتا اور کہاں ایک شہر میں رہتے ہوئے مدتوں ایک دوسرے کے بارے میں بے خبر رہیں۔

طارق عباسی کی خدیجہ سے دوسری شادی تھی پہلی شادی تھوڑا دیر ہی میں خاندانی روایات کے مطابق اپنی بچپن کی منگیتر سے ہوگئی تھی۔ اس سے ایک بچہ تھا حسن عباسی۔ قسمت کی بات تھی کہ وہ زچگی کے دوران ننھی سی جان کو زمین والوں کے سپرد کر کے چل بسی تھی۔ خدیجہ جب دلہن بن کر طارق عباسی کے آنگن میں اُتری تو اس وقت حسن عباسی

تین سال کا تھا۔ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے اپنے
باپ کی دوسری کاپی تھا۔ شفاف بھوری آنکھیں،
گلابوں سے دھلا نکھرا چہرا معصومیت اور شرارت کے
خوبصورت رنگوں سے سجا وجود جانے یہ بچے کی کشش
تھی یا طارق عباس کی وفاؤں کا کھلا اظہار کہ خدیجہ
نے اپنی ممتا کے دریا بہادیے۔ حتیٰ کہ ایاز عباسی کی
پیدائش کے باوجود اس پر سے توجہ کم نہ ہوئی۔ ہر
معاملے میں ہمیشہ اسے ہی اولیت دی جاتی رہی تھی۔
یوں حسن نے اس توجہ اور محبت کو اپنا حق سمجھ کر بٹورنا
شروع کردیا۔ اس کو یہ زعم مل گیا کہ ہر معاملے، ہر کام
میں انتخاب کا اوّلین حق اسے ہی ملے گا۔

پھر قدرت نے ایک نیرنگی یہ دکھائی تھی کہ حسن
اگر اپنے باپ کی کاپی تھا تو ایاز پورے کا پورا ماں پر گیا
تھا۔ معمولی نقوش، گہری سانولی رنگت، مزاج میں
خاموشی اور سنجیدگی البتہ باپ سے لی تھی۔ لازمی سی
بات تھی جہاں پوری فیملی جاتی اولیت ہمیشہ حسن کو ہی
ملتی ایاز کا وجود کہیں پس پردہ چلا جاتا۔ ملنے والے

جاننے والے لوگوں کے رویوں کے علاوہ خود حسن بھی
دل میں ہزار بار اپنے رویے اور زبان سے چھوٹے
بھائی کو اس کی کم روئی کا احساس دلاتا تھا جس نے ایاز
کو خاموش طبع بنادیا تھا۔

طارق عباسی کا ذاتی کاروبار تھا۔ جب
حسن نے تعلیم مکمل کی تو انہوں نے اپنے ساتھ ہی
لگالیا۔ پھر ایاز بھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ساتھ
شامل ہوگیا۔ حسن کی طبیعت میں بڑا چلبلا پن،
شوخی اور جذباتیت تھی۔ وہ کام کی طرف کم
اور ہلے گلے اور موج میلے کی طرف زیادہ شوق
سے توجہ دیتا تھا۔ جبکہ ایاز اپنے کام کا کیڑا تھا۔
تعلیم کے میدان میں حسن کے برعکس اس نے ہمیشہ
ہی ریکارڈ توڑے اور قائم کیے تھے۔ اس کی
شمولیت کے ساتھ ہی ''عباسی بلڈرز'' میں ایک
نئی جان پڑگئی۔ طارق عباسی نے جب دیکھا کہ
دونوں لڑکے کام اچھی طرح سنبھال چکے ہیں تو
کافی حد تک کاروبار کی سمت سے بےفکر ہوگئے

اور اپنے اور خدیجہ بی بی کے عمرے کے سلسلے لیے
روانگی کے پروگرام بنانے لگے۔

ان کی روانگی کے کچھ عرصہ بعد آفس میں حسن
عباسی نے ایک نئی سیکرٹری مس نتاشا محبوب کی اپائنٹمنٹ
کی۔ اس نے چند دن میں کمال ذہانت اور محنت سے کام
لیتے ہوئے کام سیکھ لیا۔

نتاشا محبوب کے آتے ہے جیسے دفتر کی ہر شے
بدل کر رہ گئی۔ وہی حسن جو دن چڑھے گیارہ بارہ بجے
سے پہلے دفتر نہیں پہنچتا تھا اب نو بجے اپنے کمرے میں
موجود ہوتا تھا۔ پہلے ایک دو گھنٹے بمشکل تمام دفتر میں
گزرتے تھے پھر وہ کلب جانے، کسی فنکشن میں جانے
کے لیے نکل جایا کرتا تھا اب ٹھیک ٹھاک وقت آفس میں
گزارنے لگا۔

ایاز کو اس تبدیلی کی خبر نہیں تھی وہ اپنے
کمرے تک ہی محدود و مگن رہتا تھا۔ اس دن اتفاقیہ
طور پر کسی کام کے سلسلے میں' اس سمت آیا تو بڑے
انہماک سے فائلوں پر جھکی ہوشربا حسن رکھنے والی

لڑکی کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

حسن عباسی کے برعکس اسے صنف نازک
سے کسی قسم کی رغبت نہ رہی تھی۔ کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں
دیکھا تھا۔ مگر کیا تھا اس پُر تمکنت قیامت خیز کافرادا حسینہ
کے سراپے میں کہ اس کی ایک جھلک اسے ہوش وحواس
سے بیگانہ کر گئی۔

"السلام علیکم۔! سر۔"

وہ اسے دیکھ کر احتراماً کھڑی ہوگئی تھی۔

"حسن بھائی بیٹھے ہیں۔؟"

اپنی بے اختیارانہ جم جانے والی نظروں کو بہلا کر
واپس موڑنے کے لیے اسے کتنی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

"وہ ابھی ابھی نکل کر گئے ہیں تھوڑی دیر پہلے۔"

اس شیریں سخن کے انداز میں کتنی شائستگی'
ملائمت اور متانت تھی۔

واقعی ساری بات دل آنے کی نظروں میں سمانے
کی ہے۔ ایک لمحے میں کوئی محبوب نظر بن جاتا ہے اس کے
سینت سینت کر بچا بچا کر رکھے گئے تمام جذبے یکلخت

اس پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کئی بار دانستہ بے
اختیارانہ بلاوجہ وہ حسن کی طرف آیا۔ جتنی بار اس سے ملا
دل اس کی کشمکش کی لہروں کے جال میں پھنستا ہی چلا گیا۔

طارق عباسی اور خدیجہ خاتون عمرے کی
ادائیگی کے بعد واپس آئے تو اس نے ایک دن
جھجکتے ہوئے خدیجہ خاتون کو حالِ دل سنا دیا۔ کہ وہ
سیدھے اور شفاف راستے سے اپنی منزل پر پہنچنے کا
خواہاں تھا۔

انہوں نے اگلے روز طارق عباسی سے بات کی۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں دونوں بچوں کے
فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ ایاز نے تو اپنی پسند
بتادی ہے۔ حسن پر آپ زور دیں کہ جلد از جلد کسی کا
انتخاب کر کے ہمیں بتائے۔''

''مزے کی بات یہ ہے بیگم کہ حسن بھی انتخاب
کر چکا ہے۔''

طارق عباسی نے یہ انکشاف کر کے انہیں حیران
کر دیا۔''

اور مجھے بھی لڑکی خاصی پسند آئی ہے۔ آفس میں کام
کرتی ہے۔ نتاشا محبوب ہے نام اس کا۔ بڑی پیاری اور نیک
لڑکی ہے بڑے اچھے شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔''

خدیجہ خاتون گم صم سی ان کی صورت دیکھتی
رہ گئیں۔

''لیکن طارق! ایاز نے بھی تو اسی کو پسند کیا ہے۔''

''ہائیں۔''

طارق عباسی بھی ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئے۔

''یہ عجیب اتفاق ہے اس طرح تو بہت مشکل
ہو جائے گا۔''

ان کے چہرے پر تفکرات کے سائے
منڈلانے لگے۔

''ایاز کو آپ جانتے ہیں ساری عمر کسی چیز کی تمنا
نہیں کی اس نے اپنے آپ میں مگن بے خبر رہا ہے۔ پہلی
بار اس نے اتنا بے اختیار ہو کر، مچل کر ایک خواہش پوری

"کرنے کے لیے اصرار کیا ہے۔"

دونوں گومگو کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے
لگے۔

"پھر اب کیا کیا جائے۔ حسن بھی اس سلسلے میں
پہلی بار اتنا سنجیدہ ہوا ہے۔"

"میرا خیال ہے دونوں سے بات کر کے دیکھ
لیں۔ ایک دوسرے پر کھلے گا تو خود ہی کوئی فیصلہ ہو جائے
گا۔ ہمیں تو بہرحال دونوں کی خوشیاں عزیز ہیں۔"

حسن عباسی کو پتا چلا تو وہ بھڑک ہی اٹھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں دستبردار ہو
جاؤں۔ یوں بھی وہ ہے بھی میرے قابل۔ ان صاحب
کے ساتھ اتنی خوبصورت اتنی بے تحاشا حسین لڑکی بھلا
سجے گی؟ پہلوئے حور میں لنگور والی بات ہو جائے گی۔
سارے لوگ ہنسیں گے۔"

اس کے لہجے میں تضحیک، طنز اور استہزا تھی۔

ایاز کے خوددار دل پر بری طرح چوٹ پڑی۔

"حسن بھائی! آپ کو میرے ساتھ اس طرح

بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" غم و غصے سے اس کی
سانولی رنگت مزید گہری پڑ گئی تھی۔

"تم خود سوچو ناں بھائی میرے کہ تم کس قدر
احمقانہ بات کر رہے ہو۔ بھلا وہ اتنی حسین لڑکی تمہارا
ہاتھ تھام سکتی ہے۔؟"

ایاز کا چہرا سرخ ہو گیا۔ اپنے تیز پڑتے تنفس پر
قابو پاتا وہ آندھی طوفان کی مانند باہر نکل گیا تھا۔

اگلے دن وہ نتاشا محبوب کے سامنے اپنے سچے
پر خلوص جذبات کا اظہار کر کے اس کی رائے جاننے کو
بے تابی سے منتظر نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکائے ہمہ تن
گوش تھا۔

نتاشا نے کشمکش کے عالم میں دونوں ہاتھوں کی
انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ پھر دھیمے سے نظریں
جھکائے بولی۔

"دیکھیے جی۔ اس بات کا فیصلہ میں نے امی جان
پر چھوڑ رکھا ہے۔ سو وہی مجاز ہیں انتخاب کرنے کی۔"

"حسن بھائی! آپ نے زندگی بھر جو چاہا

حاصل کرلیا۔ بن مانگے ہی محبتیں اور چاہتیں آپ
کی جھولی میں گرتی رہیں آپ کو کچھ کمی نہیں کسی بھی
شے کی۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین و ماہ جبیں لڑکی
مل جائے گی، جس پر انگلی رکھ دیں گے آپ کی
ہو جائے گی مگر میرے بنجر، سنسان دل کے صحرا میں
صرف ایک ہی پھول کھل کر بہار دکھا سکتا ہے۔
آپ نے تو شاید اپنی فطرت کے مطابق وقتی کشش
کے زیر اثر یہ فیصلہ کیا ہے مگر میری زندگی میں بس
یہی واحد سکھ ہے۔''

اس کی التجا آمیز نظروں کے جواب میں وہ
نہایت لاپروائی سے صوفے پر نیم دراز پاؤں ہلاتے
ہوئے کہنے لگا۔

''او بھائی! کیوں اپنا تماشا بنوانے چلے ہو۔
بھلا سوچو، نتاشا کے گھر والوں کے سامنے پرپوزل رکھی
جائے گی تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟۔''

اور اس کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔
جواب حسب توقع تھا۔ انہوں نے پہلی نظر میں ایاز

عباسی کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ البتہ حسن عباسی کے لیے
انداز میں خاصی پسندیدگی نمایاں تھی۔ خدیجہ بیگم حیرت
میں گم تو اس وقت ہوئیں جب عائشہ بیگم کو نتاشا محبوب
کی ماں کے روپ میں سامنے موجود پایا۔ وقتی طور پر
پرانی رنجشیں بھلا کر خاصے تپاک سے دونوں ایک
دوسرے سے ملیں۔

''عائشہ! گو میں نے کبھی حسن اور ایاز میں فرق
محسوس نہیں کیا ہے۔ دونوں کو ایک ہی توجہ اور ممتا کے
جذبات کے ساتھ پالا ہے۔ مگر نتاشا میرے ایاز کی پہلی
خوشی اور خواہش ہے وہ نہ ملی تو اسکے ارمانوں کی دنیا
اندھیر ہو جائے گی۔''

جواب میں ایک پراسراری مسکراہٹ عائشہ بیگم
کے ہونٹوں پر مچلنے لگی۔

''ارمان تو بس ارمان ہی ہوتے ہیں کبھی
آنسوؤں میں بہہ جاتے ہیں اور کبھی دل کے دل میں ہی رہ
جاتے ہیں۔''

وہ انہیں بہت پرانی بات یاد دلا رہی تھیں۔ وہ ابھی تک وہ پرانا زخم نہیں بھولی تھیں اور بدلہ لینے کا اس سے بڑھ کر موقع اور کون سا ہو سکتا تھا۔

"بھئی تمہاری خواہش پر تمہارے بیٹے کا رشتہ قبول کر رہی ہوں مگر حسن عباسی کا۔ کہ اس کے ساتھ جوڑ بنتا ہے۔ میری بیٹی کا۔ میں بے جوڑ رشتے بنانے کی قائل نہیں ہوں۔"

"مگر عائشہ! ایاز میں کس چیز کی کمی ہے ماسوائے ظاہری صورت کے وہ حسن سے کسی طور کم نہیں ہے۔" ان کی ممتا تڑپ اٹھی تھی مگر عائشہ بیگم کا فیصلہ اٹل تھا۔

دولہا بنے حسن عباسی نے جن فاتح اور مغرور نگاہوں سے ایاز عباسی کو دیکھا تھا اس نے ایاز کے ساتھ ساتھ خدیجہ بیگم کے دل پہ بھی جیسے گھونسا سا رسید کیا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی عائشہ بیگم نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حسن عباسی پر اپنا

اثر جمانا شروع کر دیا۔ کچھ مدت بعد کسی معمولی بات پر اختلاف کے بعد حسن نے "عباسی بلڈرز" میں سے اپنے شیئر الگ کر لیے اور "حسن بلڈرز" کے نام سے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ عائشہ بیگم نے اچھی طرح سے سکھانا پڑھانا شروع کر دیا کہ اس کی سوتیلی ماں اور بھائی اس کا حق مارتے رہے ہیں اس کے باپ کی جائیداد پر قابض ہو کر دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے ہیں۔ اوپری محبت جتاتی ہے خدیجہ بیگم۔ ورنہ اس نے کبھی دل سے تمہیں اپنا بیٹا نہیں مانا۔ اس کی ہمدردیاں اپنے سگے بیٹے کے ساتھ رہی ہیں۔ بہتر ہے تم بھی ان کا خیال کرنا چھوڑ دو۔ اس طرح حسن عباسی کو خدیجہ بی بی اور ایاز عباسی کے اتنا خلاف کر دیا کہ وہ جائیداد میں سے حصہ لے کر الگ ہو گیا۔ پھر عائشہ بیگم کے شدید اصرار پر جب "عائشہ ہاؤس" شفٹ ہوا تو خدیجہ بی بی کا ضبط جواب دے گیا۔

"عائشہ! یہ تم مجھ سے کس قسم کا بدلہ لے رہی ہو۔؟"

ان کی پیشانی پر بہت سی ناگوار شکنیں پڑ گئی تھیں۔

جواب میں انہوں نے ایک ٹھٹھا لگایا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے پلّے بدلہ لینے کی۔ تقدیر خود تمہیں سبق سکھا رہی ہے جو کچھ تم نے کیا تمہارے سامنے آ رہا ہے۔"

اس کی زہریلی ہنسی خدیجہ بی بی کو بری طرح تپا گئی۔

"میں نے کیا کہا تھا۔ تقدیر مجھ پر مہربان تھی۔ سو مجھے میرے نصیب کا لکھا مل گیا تم ابھی تک اسی بات کو دل پر لیئے بیٹھی ہو! اب کوئی عمر رہی ہے ان باتوں کی۔"

"عمر اور وقت کوئی بھی ہو، زخموں کی فصل ہمیشہ تازہ رہتی ہے خدیجہ بی بی۔!"

ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے انہوں نے براہ راست خدیجہ بی بی کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا۔

"ایک کھیل تقدیر نے دکھایا تھا مجھے اور اب یہ باری تمہاری ہے۔ اب تم دیکھو تماشا۔ اس وقت قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تھا اور اب میری باری ہے۔"

ہونہہ! سازشی عورت۔ دکھا لو اپنی کم ظرفی جتنی دکھا سکتی ہو۔ بھڑکا لو میرے بیٹے کو جی بھر کے میرے خلاف دیکھتی ہوں کہاں تک کر سکتی ہو تم۔!"

جواب میں انہوں نے طویل قہقہہ لگایا۔

"ارے بھئی اتاولی کیوں ہوتی ہو۔ ابھی تو تمہیں دوسرا مرحلہ طے کرنا ہے۔ دوسرے بیٹے کی شادی کرنا ہے۔ اپنے اس کم صورت، بے کشش بیٹے کی شادی۔"

کس قدر زہرناک طریقے سے مذاق اڑا رہی تھیں، وہ ایاز کی کم روئی کا۔ خدیجہ بی بی کے دل میں جیسے بھانبھڑ جلنے لگے۔

"بڑا زعم ہے تمہیں اپنی اور اپنی بیٹی کی خوبصورتی کا۔ دیکھنا اپنے بچے کے لیے ایسی دلہن لاؤں گی جس کے آگے تم دونوں پانی بھرتی نظر آؤ گی۔"

اور پھر انہوں نے یہ ممکن کر دکھایا۔ جمیلہ خاتون سچ مچ بے تحاشا حسین اور خوبصورت تھیں۔

''ہونہہ اولاد تو باپ پر ہی جائے گی ناں نسل تو تمہاری وہی رہے گی۔''

عائشہ بیگم طعنہ زنی سے ابھی بھی باز نہیں آئی تھیں۔ مگر ارسل کی پیدائش نے ان کے سینے پر سانپ لوٹا دیے۔ اس نے ایک نقش بھی باپ کا نہیں چرایا تھا۔ اپنے دادا اور ماں کی ساری۔ خوبصورتیاں سمیٹ لایا تھا اپنے وجود میں۔

یہ الگ بات تھی کہ رفعت اور نبیل نے البتہ باپ کی رنگت چرائی تھی۔ اس وقت ارسل پانچ چھ سال کا تھا جب حسن عباسی کے ہاں منتوں مرادوں کے بعد زرشہ کی پیدائش ہوئی۔ وہ ہو بہو ماں اور باپ کا عکس تھی۔

عائشہ بیگم پھولے نہیں سما رہی تھی۔ انہیں اپنی خاندانی وجاہت اور خوبصورتی کے راگ الاپنے اور اس پر مغرور ہونے کا ایک اور ذریعہ مل گیا تھا۔ حسن

عباسی مکمل طور پر عباسی فیملی سے کٹ چکا تھا۔ دلوں میں اتنی کدورتیں اور بدگمانیاں در آئی تھیں کہ مدتوں ایک شہر میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے بارے میں بے خبر رہے۔ اس وقت زرشہ چھ سات سال کی تھی جب حسن عباسی اور رناشا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے یوں زرشہ کو ثمین خالہ اپنے ساتھ مصر لے گئیں شادی کے بعد۔

ماضی کی نفرتیں، عداوتیں اور غبار نئی نسل کے اذہان میں بھی اسی تسلسل سے در آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خون کی فطری کشش کے باوجود دونوں گھرانوں کے بچوں نے گریز پائی اختیار کی ہوئی تھی۔

"اسی ایک سال نے کتنا بدل دیا ہے تجھے زری۔ اتنی چپ چپ اور سنجیدہ صورت تو تیری کبھی امتحانوں کے دنوں میں بھی نہیں ہوتی تھی۔"

اُسے یہاں آئے ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔ اور نانی اس کے معمولات اور مزاج کے ٹھہراؤ پر اچنبھے میں پڑی بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"بس نانی! اب بڑی بھی تو ہو گئی ہوں ناں۔"

پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر اس نے ٹالنا چاہا مگر نانی کچھ مطمئن نہ ہوئیں۔

"اب کی بار تو نے اپنی دادی سے ملنے کی ضد بھی نہیں کی۔ ان کے

ہاں بھی نہیں گئی حالانکہ تجھے کل سے کہہ رہی ہوں کہ دنیا دکھاوے کو ہی سہی ارسل کی طبیعت پوچھ آؤ۔ سارے جان پہچان کے لوگ پوچھنے آئے ہیں اسے۔ بچارے بچے کو بیماری بھی تو اتنی سنگین لاحق ہے۔ خدیجہ کے اعمالوں کی سزا اس غریب کو مل رہی ہے۔"

نانی کے انداز میں تاسف، تمسخر اور ہمدردی کا امتزاج تھا۔ زرشہ نے اپنے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات کو اس حد تک سرد کر لیا جیسے اس بات کا ذات سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ ہو۔

جس گاؤں نہیں جانا اس کے کوس کیا گننا
کیوں رات کی ریت پہ بکھرے ہوئے
تاروں کے کنکر چنتی ہو؟
کیوں سناٹے کی سلوٹ میں
لپٹی آوازیں سنتی ہو؟
کیوں اپنی پیاسی پلکوں کی جھالر میں
خواب پروتی ہو؟
کیوں روتی ہو؟
اب کون تمہاری آنکھوں میں
صدیوں کی نیند انڈیلے گا؟

اب کون تمہاری چاہت کی

ہریالی میں کھل کھیلے گا

اب کون تمہاری تنہائی کا

ان دیکھا دکھ جھیلے گا

اب ایسا ہے!

یہ رات مسلط ہے جب تک

یہ شمعیں جب تک جلتی ہیں

یہ زخم جہاں تک چبھتے ہیں

یہ سانسیں جب تک چلتی ہیں

تم اپنی سوچ کے جنگل میں

رہ بھٹکو اور پھر کھو جاؤ!

اب سو جاؤ!

''ارسل۔!''

وہ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر کمرے کے ملگجے ماحول کو تبدیل کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئی۔

''اگر تم کہو تو میں زرشہ کو بلا دوں ادھر۔''

نگین بہت ٹھہرے ہوئے، جیسے ہمدردانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''نہیں۔نہیں خدا کے لیے یہ ظلم نہ کرنا مجھ پر۔''

اس کی بے ساختہ پکار سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے یکلخت اس کے قدموں تلے انگارے بچھا دیے ہوں۔

نگین نے متاسف وملول نظروں سے اس کے نحیف ونزار وجود کی سمت دیکھا۔ ارسل کا تنفس بہت تیز چلنے لگا تھا۔ چہرہ لال انگارہ ہو گیا تھا۔

''میں نہیں دیکھنا چاہتا اسے۔''

وہ بے قراری کے عالم میں بستر پہ ادھر اُدھر سر ہلانے لگا۔

''میں موت سے پہلے نہیں مرنا چاہتا۔''

اس کی اعصابی مضبوطی پانی بن چکی تھی۔

''اسے ایک ہفتہ ہو گیا ہے آئے ہوئے۔ ایک بار بھی دل نہیں مچلا۔ پھر میں بھی کیوں۔''

اس کی حالت کسی ضدی بچے کی سی ہو رہی تھی جو ماں کی بے توجہی کے جواب میں اس سے روٹھ گیا ہو۔

''تم ہرگز بھی اسے نہیں بلاؤ گی۔''

اس نے سختی سے منع کر دیا۔

''ٹھیک ہے۔''

نگین نے گہری سانس لی۔''

"لیکن اگر وہ خود آ جائے تو۔ تو بھی اس سے نہیں ملو گے۔؟"

اس کے لہجے میں استفسار تھا۔

"نہیں۔"

اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"مجھے اب کسی سے ملنے، کسی کو دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ سمجھ لیا ہے میں نے دل کو۔ مار لیا ہے اپنے من کی خواہش کو۔ مجھے اب کسی سے نہیں ملنا۔ کسی کا ارمان نہیں ہے مجھے۔"

اس نے تکیوں میں منہ چھپایا۔ غم و اندوہ سے بوجھل آواز۔ وہ بے دم سا ہو کر رہ گیا تھا۔

ادھر اپنے دل کے بڑھتے ہوئے بے کل جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دیکھنے کی خاطر آئی۔ زرشہ کے قدم جیسے کمرے کی دہلیز نے روک لیے تھے۔ اس نے جونہی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔

یہ وہ ارسل تھا جس کی شوخی و شرارت کے ہاتھوں تنگ آ کر کتنی ہی بار وہ جنونی ہوئی تھی۔ کیسا زندگی سے بھرپور وجود ہوا کرتا تھا۔ کیسا ایک دم چھایا ہوا، مطمئن شانت اور ہر دم۔ امید کی سمت گامزن رہنے والا دکھائی دیا کرتا تھا۔

یہ اتنا کمزور، اتنا زرد زرد مرجھایا ہوا زندگی کی لالی سے کوسوں بے نیاز شخص ارسل تو نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اس سے بغیر ملے شکستہ دلی کے عالم میں گھر لوٹ آئی تھی۔ رات وہ کتنی ہی دیر بے کل و بے چین رہی۔ دیکھا نہیں تھا تو گریز کے ان دیکھے حصار نے خود پر ضبط کے پہرے بٹھانے میں پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ مگر اب آنکھوں کی پتلیوں میں جیسے ایک ہی نظارہ ٹھہر — کر رہ گیا تھا۔ نئے سرے سے زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے۔

"آئی تو ہے، لیکن مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہیں قاہرہ ہی میں رہ گئی ہے نہ پہلے کی طرح شوخیاں، شرارتیں، باہر اندر گھومنے پھرنے کی ضدیں، ہلے گلے اور شور شرابے کے شوق بس گم صم سی سنجیدہ شکل بنائے بیٹھی خلاء میں گھورتی رہتی ہے۔ شاہین خالہ اور عاطف ویک اینڈ پر ملنے کے آئے تو نانی نے اپنا دکھڑا رو دیا۔

"کیوں پارٹنر۔ کیا یہ سچ ہے کہ تم میں انقلاب انگیز تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔؟" وہ لان میں بیٹھی خاموشی سے پودوں کی گوڈی کرتی زرشہ کے پاس گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھتے ہوئے دریافت کرنے لگا۔

"وقت بھی تو بہت بدل گیا ہے عاطف۔"

اس کے لہجے میں بدستور سنجیدگی کا عنصر تھا۔

"کہتی تو صحیح ہو۔"

عاطف بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"میں بھی یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ مزید ٹائم ضائع کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ دراصل زرشہ امی جان اور شاہین بھائی شادی کے لیے میرے سر ہو گئے ہیں اور جلدی جلدی کا شور مچایا ہوا ہے۔ سوچتا ہوں بتا ہی دوں انہیں لیکن سمجھ نہیں آ رہا یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی۔؟ اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم ہی میرے لیے سپورٹنگ رول ادا کر سکو گی۔ اس معاملے میں۔"

یہ عاطف نے پر امید نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہاں۔ تم کہو۔"

زرشہ نے بھی اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

"نگین۔!"

مختصر ترین الفاظ میں بتا کر وہ اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کے لیے بغور اسے دیکھنے لگا۔

زرشہ نے سوچنے کے سے انداز میں اس کی سمت دیکھا۔

"مشکل ہے اور وہ بھی ٹھیک ٹھاک قسم کی مشکل ویسے دوسری طرف

کیا پوزیشن ہے کیا وہ راضی ہے۔"

"نہ میں نے کبھی پوچھا نہ اس نے کبھی بتایا۔ ویسے اس کے چہرے کے تاثرات اور ڈھکا چھپا کترایا انداز اس کی پسندیدگی کی واضح دلالت کرتا ہے۔"

"بڑا تجربہ ہے بھئی۔"

اس کے روانی کے عالم میں بے اختیار منہ سے نکلنے والے جملے نے بے ساختہ ہی زرشہ کو ہنسا دیا تھا۔

اس دن وہ کچھ گھریلو سودا سلف لانے کے لیے گاڑی نکال رہی تھی۔ گاڑی باہر لا کر روکی اور اتر کر گیٹ بند کر کے جونہی مڑی۔ ساکت سی رہ گئی۔

خود سے بیزار نڈھال سا ارسل اندر کی یکسانیت سے زچ ہو کر لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں سے لان عبور کر کے باہر گیٹ کے پاس آ گیا تھا اور دیوار سے پشت ٹکائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سڑک کے اطراف ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

اب فرار کا کوئی رستہ نہیں رہا تھا۔ گریز پائی کے لیے کوئی ساعت نہ بچی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کے مقابل کچھ فاصلے سے کھڑے بے اختیار پیاسی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

پھر دونوں کے لب مرتعش ہوئے۔ کچھ کہنے کو بے تاب ہوئے۔ مگر سارے قصے ساری کہانیاں ساری باتیں جیسے لبوں پہ آتے آتے ٹھہر کر رہ گئیں۔ دونوں کے درمیان پانچ فٹی سڑک حائل تھی۔ مگر نہیں۔

دونوں کے درمیان برسوں پہ محیط دشمنی، عداوت اور نفرت کی خلیج حائل تھی۔ دونوں کے درمیان مجروح جذبات کے ردعمل کے طور پہ پلتے جوابی منتقمانہ جذبات حائل تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ پسپائی کے لیے قدم اٹھائے۔ ارسل لڑکھڑاتے قدموں سے دیوار کا سہارا لیے کھلے گیٹ سے دھیرے دھیرے اندر کی طرف بڑھنے لگا اور وہ تھکے تھکے ٹوٹے بکھرے انداز میں ڈرائیونگ سیٹ کی جانب آ گئی۔

گاڑی بیک کرتے ہوئے یونہی اس نے کھلے گیٹ سے اندر کی جانب نگاہ کی۔ اور جیسے برقی رو کی سی تیزی سے ایک سنسنی آمیز احساس اندر کوندتا گیا۔ عین اس لمحے ارسل نے بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے اختیار پلٹ کر دیکھا تھا۔ پھر گہری افسردہ سانس سوگوار و ساکت فضا کے حوالے کرتے ہوئے دونوں اپنی اپنی منزل کی سمت

روانہ ہو گئے۔

بظاہر یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ دونوں بے خبر رہے تھے کہ ان کا راز راز نہیں رہا تھا۔ عائشہ ہاؤس کے ٹیرس پہ کھڑی عائشہ بیگم اور اتفاقاً "خدیجہ ہاؤس" کے ٹیرس کے ریلنگ سے ٹیک لگائے خدیجہ بی بی نے نہایت غور سے خاموش اظہار کا یہ مظاہرہ دیکھا تھا۔ اس کے مطالب و معانی سمجھنے میں قطعی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ دونوں ان لطیف وارداتوں کے ہر ہر پہلو سے آشنا تھیں۔

ارسل اس اسٹیج تک کیوں پہنچا؟ یہ خدیجہ بی بی کی سمجھ میں آ گیا۔

زرشہ کی بے ساختگی روانی اور لاابالی پن کو کس کی نظر کھا گئی؟ یہ عائشہ بیگم پر کھل چکا تھا۔

وہ رات جہاں ارسل اور زرشہ پر بھاری تھی وہاں دو اور ہستیاں بھی ماضی، حال اور مستقبل کی کڑیاں جوڑنے میں لگی رہیں۔

تو یہ تھا سارا قصہ' خدیجہ ہاؤس کے ہر فرد پر کھل گیا تھا۔

"گویا وہ میرا او ہمہ نہیں تھا۔"

نبیل نے اس انکشاف کے بعد پرخیال نظروں سے رفعت کی جانب دیکھا تھا۔

''مجھے جانے کیوں بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ بھائی کی اس حالت کا زرشہ کی روانگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔''

''ارسل مجھے اسی زمانے میں یہ بتا چکا تھا۔''

نگین شکر ادا کر رہی تھی کہ کم از کم اس کی پوزیشن تو کلیئر ہوئی۔

''اسی لیے میں خصوصی طور پر اس کا خیال کر رہی تھی۔ کیونکہ یہ بات اس نے صرف مجھ سے ہی شیئر کی تھی۔''

''تو پھر تم نے بتایا کیوں نہیں بیٹے۔''

ایک گہری ملول و متاسف افسوس زدہ سانس چھوڑتے ہوئے جمیلہ بیگم نے دردمندی سے کہا تھا۔

''کیا فائدہ ہوتا خالہ جان۔!''

اس نے دھیمے سے کہا۔

کمرے میں ایک سوگوار سا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

شاہین خالہ نہایت جرأت سے اپنے سسرالی رشتہ داروں سمیت عاطف کا رشتہ لے کر ''خدیجہ ہاؤس۔'' پہنچ گئی تھیں۔

''دیکھیے خالہ جان۔!

آپ کے اور امی کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اپنی جگہ مگر مجھ سے اور سسرالیوں سے اس گریز کا کوئی جواز نہیں بنے گا۔ نہ میرے اور میرے سسرالیوں کے دل میں ایسی بات ہے نہ آپ اپنے دل میں رکھیے۔''

شاہین خالہ تو دو ٹوک بات کرنے کی عادی تھیں۔ یوں بھی نگین کا اس حریفانہ کارروائی میں کیا حصہ بنتا تھا۔ وہ خدیجہ بی بی کی بھانجی کی اولاد تھی۔ اور عاطف کا بھی ''عائشہ ہاؤس۔'' والوں سے براہ راست کوئی گا

رشتہ نہیں بنتا تھا۔ نگین کا گھر تو نہیں بسانا ہی تھا۔ اور عاطف میں بھی ماسوائے عائشہ بیگم سے تعلق واسطے کے اور کوئی برائی نہیں تھی۔

سو کچھ ٹال مٹول کے بعد بالآخر رشتہ قبول کرلیا گیا اور منگنی کی تاریخ طے ہوگئی۔ خاندان کی پہلی خوشی تھی۔ سو مہمانوں کا جم غفیر جمع ہونا لازم تھا۔ رات گئے تک ہنگامہ جاری رہا۔ دنیا دکھاوے کو عائشہ بیگم بھی زرشہ کے ہمراہ موجود تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ رات گہری پڑتے ہی سب نے اپنے گھر کی راہ لی۔ آخر میں عائشہ بیگم بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تمہارا تو دو قدم سامنے گھر ہے ابھی بیٹھو پہلی بار تو آئی ہو۔''

خدیجہ بی بی نے انہیں اٹھتے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا۔ ان کے لہجے میں سچائی محسوس کر کے وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئیں۔ جمیل خاتون اور ایاز عباسی کا رویہ بھی بڑا احترام آمیز تھا۔ یوں بھی شروع سے ہی دونوں نے کبھی دونوں سہیلیوں کے مابین جاری جذباتی جنگ میں کودنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہمیشہ سے ہی روادانہ انداز میں پیش آتے رہے تھے۔

''ارسل کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔؟''

عائشہ بیگم متاسفانہ نظروں سے جمیلہ خاتون کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''خوش رکھا جائے اسے۔ جتنا زیادہ اس کے اندر زندگی کی سمت

دلچسپی اور رغبت بڑھے گی' اتنی ہی جلدی یہ مرض دور بھاگتا جائے گا۔''

عائشہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''بیٹے! خود کو سنبھالو تم۔ دیکھو سب تمہارے بارے میں کتنے متفکر رہتے ہیں۔ بچے ابھی تو زندگی میں بہت کچھ دیکھنا ہے تمہیں۔''

ارسل کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے وہ بڑی اپنائیت سے ناصحانہ انداز میں بولی تھیں۔

''جی نانی جی۔!''

ایک مجروح تبسم اس کے زندگی کی رمق سے محروم چہرے پر کھلنے لگا تھا۔

''یہی سوچ کر میں نے پروگرام بنایا کہ یورپ چلا جاؤں۔ بلکہ اس سلسلے میں کاغذی کاروائی بھی مکمل کروائی ہے۔ بس چند یوم کی بات ہے۔''

زرشہ جو اتنی دیر سے فرش پر نظریں جمائے مکمل طور پر ماحول کی سوگواریت سے اجتناب کا مظاہرہ کیے ساکت بیٹھی تھی ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ہکا بکا ارسل کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آناً فاناً اس کا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

''کتنا سمجھایا ہے منتیں کی ہیں مگر مانتا ہی نہیں۔''

دلگیر و دلگرفتہ لہجے میں کہتے ہوئے خدیجہ بی بی نے بے بسی سے

عائشہ بیگم کی سمت دیکھا تھا۔

''دادی بی۔! میں شاید اس طرح خوش رہ سکوں گا۔''

اس کا نہایت دھیما لہجہ اس کے اندرونی خلفشار کا غماز تھا۔ پھر وہ رُکا نہیں۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اوپر جانے کے لیے زینے کی سمت آیا تھا۔

''آیئے نانی جان! بہت دیر ہو چلی ہے۔''

زرشہ بھی اٹھ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی۔ مگر عائشہ بیگم ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

''اور جو میں اس کے یہیں خوش رہنے کا سامان کر دوں تو۔؟''

عائشہ بیگم فیصلہ کن انداز میں خدیجہ بی بی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

خدیجہ بی بی کو جیسے یقین نہ آیا۔ آنکھیں پھاڑے کتنی ہی دیر سنسناتے دل سے ان کی سمت دیکھتی رہیں۔

''کیا کہا تم نے عائشہ۔؟''

وہ بے اعتبار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''وہی جو ہمارے بچوں کی خوش وخرم اور پرسکون زندگیوں کے لیے ضروری ہے۔''

عائشہ بیگم کا یکلخت پگھل جانا خدیجہ بی بی کے لیے تو استعجاب آمیز تھا

ہی مگر باقی سامعین وحاضرین کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ تحیر وتعجب کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

اور پھر انہوں نے دوسری چٹان پگھلتے ہوئے دیکھی جب خدیجہ بی بی نہایت بے قراری کے عالم میں عائشہ بیگم کے قریب آئیں اور پرجوش طریقے سے ان کے ہاتھ تھام کر دبائے۔

تم تم نے بالکل صحیح کہا عائشہ! یہی ہمارے بچوں کے لیے بہتر ہے کب تک ہم عہد رفتہ کی ناآسودگیوں پر اپنی اولاد کی خوشیوں کو بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔ ماضی اپنی بے کشش اور بدصورت تلخیوں سمیت ختم ہو چکا ہے پھر ہم کیوں خود کو ابھی تک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم کیے ہوئے ہیں؟ ہمیں حال میں آ جانا چاہیے۔ حال کے حقائق کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہمارا ماضی ایک کسک تھی کیا ہم اپنی اولاد کا ماضی بھی ان کے لیے کسک ہی بنا دیں۔؟''

''ٹھیک کہتی ہو خدیجہ تم۔ غلطی شاید میری ہی تھی۔ مجھے تقدیر کے لکھے کو قبول کر لینا چاہیے تھا یہ حقیقت جان لینی چاہیے تھی کہ دنیا میں محض حسن کا زعم ہی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوا کرتا۔ صورتیں تو اوپر والا بنانے والا ہے اس میں انسانی کمال کیا ہوا۔''

عائشہ بیگم کھلے دل سے اعتراف کر رہی تھیں۔

پھر صدیوں کے ٹوٹے بچھڑے رشتوں کا ملاپ شروع ہوا۔

''ارے وہ کہاں ہیں جس کے لیے یہ بزم بہاراں سجائی گئی ہے۔''

نبیل کی استفہامی آواز نے باقی سب کو بھی متوجہ کر لیا۔

واقعی وہ دونوں ادھر نہیں تھے اس انقلاب سے قطعی بے خبر تھے۔ ارسل اوپر کمرے میں جا چکا تھا اور زرشہ نانی کے انتظار میں بیرونی دروازے کے باہر لان کی ملگجی روشنی میں کھڑی تھی۔

''میں لاتی ہوں ارسل کو۔''

نگین برق رفتاری سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

زرشہ انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے دھیرے دھیرے لان میں ٹہلنے لگی کچھ ساعت بعد بیرونی دروازہ کھلا مگر خلاف توقع ادھر سے نانی کے بجائے نگین اور ارسل کو آتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''بھئی بات کیا ہے کیوں کھینچ کے لائی ہو۔؟''

ارسل اس سے الجھ رہا تھا۔ مگر اس نے زرشہ کے قریب آ کر ہی دم لیا۔

''لیں آپ ادھر ٹہل رہی ہیں اور ادھر ''انقلاب عظیم'' رونما ہو چکا ہے۔''

''کیا مطلب۔؟''

زرشہ کے تحیر آمیز انداز پر اس نے بڑے مزے لے لے کر دونوں کو ایک ساتھ سب کچھ بتا دیا اور پھر وہاں سے اڑن چھو ہونے

میں دیر نہ لگائی۔

وہ یہ خوشی دونوں کے ایک ساتھ شیئر کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔

دونوں کتنی ہی دیر گنگ سے کھڑے رہے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے گفتگو کا آغاز کریں۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟ کتنی ہی دیر بعد بالآخر زرشہ نے سکوت کا پردہ چاک کرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں بے چینی اور گھبراہٹ کے عالم میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے ہوئے تھی۔ اس کے لہجے میں واضح لرزش تھی۔

''تمہارے بغیر ادھورا، بکھرا، ٹوٹا اور نامکمل۔''

کچھ ساعت بعد اس کا گمبھیر سا دھیما لہجہ کانوں سے ٹکرایا تھا۔

زرشہ نے بے اختیار ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے عین اس کے مقابل بہت نزدیک آن رکا اور دوسرے لمحے اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا گلاب چہرا لیے ایک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

اس کی نگاہوں میں اتنی دیوانگی، وارفتگی اور حدت تھی کہ وہ بری طرح خوفزدہ ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں اور نگاہوں کے لمس نے اسے اپنے آپ میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کسمسا کر اس کے ہاتھ چہرے سے

ہٹانے چاہے۔

”زری زری، میری روح، میری جان، میری کائنات آئی لو یو۔ آئی لو یو ٹو مچ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی بھی نہیں رہ سکتا میری زندگی۔“

اس کی قربت کے نشے میں سرشار وہ مدہوش سے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ حیا وحجاب کے مارے پاگل سی ہوگئی تھی۔ ارسل کا دیوانہ پن بری طرح اس کے اوسان خطا کر گیا تھا۔

”پپ۔ پلیز۔ ارسل خدا کے لیے ہوش کی دوا کرو کچھ۔“

بدقت تمام اپنا آپ چھڑاتی بکھرتی بے ترتیب سانسیں درست کرتے ہوئے وہ۔ حجاب آمیز خفگی سے کہہ رہی تھی گال بری طرح دہکنے لگے تھے اس کے شرمیلے انداز نے اس کے حسن جہاں سوز کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ ارسل کو اپنے وارفتہ مچلتے بہکتے جذبات پہ قابو پانے میں بہت ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔

”تم بہت اچھی مگر بہت ظالم شے ہو۔“

اس کے سر پہ چپت لگاتے ہوئے بڑے گمبھیر سے ذومعنی انداز میں وہ ہنس پڑا تھا۔

زرشہ نے جواباً غیض کے اظہار کے لیے گھور کر اس کی سمت دیکھنا

چاہا مگر ان چمکیلی بھوری نگاہوں کے بے باک مچلتے وارفتہ شعلے اس کے پورے وجود کو بھسم کرنے کے درپے ہوگئے تھے۔ اس نے فوراً سے پیشتر نگاہ چرالی تھی۔

تیرے لیے ہے میرا دل میری جاں
ہوتے ہیں تو ہوں فاصلے درمیاں

موقعے کی عین مناسبت سے اوپر کی منزل پہ نبیل کا کیسٹ پلیئر آن ہو چکا تھا۔

شاید دونوں کا جذبہ صادق تھا جو صدیوں پہ محیط فاصلوں کو عبور کرنے کے بعد آج وہ ہجر کا سمندر پار کر کے وصل کی دہلیز پہ آن پہنچے تھے تقدیر کو، روایتی عداوت کو، دشمنی اور نفرت کو، دوریوں کو، ہر شے کو شکست دے کر۔

اختتام